دُنیائے تبسّم

از

شوکت تھانوی

حالی پبلشنگ ہاؤس ، دہلی

نقش چہارم ...

قیمت ......

دنیائے تبسم

از

شوکت تھانوی

UNIVERSITY LIBRARY
MUSLIM UNIVERSITY; ALIGARH

حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی

قیمت عہ/

Ram Babu Saksena Collection.

UNIVERSITY LIBRARY
۳۲۹۸۸
UNIVERSITY, ALIGARH

1983

فہرست مضامین

نمبر شمار		صفحہ
۱	مقروض	۱
۲	بنارس میں گنبد	۱۵
۳	لکھنؤ کانگریس سشن	۲۴
۴	اختلاج	۳۴
۵	تکیہ کا غلاف	۴۳
۶	ایک شعر	۵۱
۷	ڈبلو۔ ٹی	۵۹
۸	کرفیو آرڈر	۶۹
۹	مرحومہ	۷۷
۱۰	فلم فوجدار	۸۷
۱۱	موازنہ لکھنؤ و لاہور	۹۸
۱۲	احمق اداکار	۱۱۰

۱۳	شوہر یا ایڈیٹر	۱۲۸
۱۴	شہتوت	۱۳۸
۱۵	مکھیاں	۱۴۸
۱۶	پروفیسر	۱۵۷
۱۷	ڈاکٹر	۱۶۴
۱۸	بردکھوّا	۱۷۴
۱۹	میں ایک بے روزگار ہوں۔	۱۸۴
۲۰	سرودِ خانۂ ہمسایہ	۱۹۴
۲۱	بحرالعلوم	۲۰۴

کچھ شوکت صاحب کی دنیائے تبسم پر

(رشید احمد صدیقی علیگ)

پچھلی تعطیلوں میں شوکت صاحب نے فرمائش کی کہ میں ان کے زیر نظر مضامین (دنیائے تبسم) پر کچھ لکھ دوں۔ میں فوراً رضامند ہوگیا لیکن تعطیل میں کام کرنے کا جو وعدہ کرلیا جاتا ہے اسے تعطیل ہی میں پورا کر دینا نہ میرے بس کی بات ہے اور نہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ تعطیل میں وہ کام کرے جسے کام کرنے کا سلیقہ نہ ہو۔ یا جو کام نہ کرنے کے فن سے ناواقف ہو۔ میں نے اس فن پر بڑا ریاض کیا ہے۔ اول تو یہ کہ یہ بڑی کم ظرفی ہے کہ ادھر کام آیا، ادھر لگے اسے کرنے۔ میں پہلے تو ہر قسم کا کام اکٹھا کرتا جاتا ہوں۔ اور جب سمجھ لیتا ہوں کہ کاموں کی اچھی خاصی مقدار جمع ہوگئی ہے تو پھر ان کی کھتونی شروع کرتا ہوں۔ بڑے کام۔ اوسط کام۔ چھوٹے کام۔ اس کے بعد اوسط کاموں کو چھوٹے کاموں سے ٹکراتا ہوں۔ اس میں سارے چھوٹے کام پاش پاش ہوکر ختم ہوجاتے ہیں۔ اور اوسط کام بھی اچھی خاصی تعداد میں مجروح ہوجاتے ہیں۔ اب اوسط کو بڑے کاموں سے ٹکراتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ سارے 'اوسط' کام آجاتے ہیں اور بڑوں میں بھی مقتولین و مجروحین کی تعداد کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد جو جانچ پڑتال کی جاتی ہے، تو صرف بعض سخت جان باقی ملتے ہیں۔ ان کو اپنی سہل انگاری، حیلہ پردازی، ناکسی و نااہلی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی زد میں جن کا اعلان نامناسب ہے، لاتا ہوں۔ نتیجہ اکثر خاطر خواہ نکلتا ہے۔ میرا کچھ نہیں بگڑتا لیکن کاموں کا مطلع صاف ہوجاتا ہے۔ قرض کے معاملہ میں بھی یہی اصول بعض جزئی ترمیم کے ساتھ کام میں لاتا ہوں لیکن میں کم سے کم یہاں خواہ مخواہ غیر متعلق مسائل چھیڑنا نہیں چاہتا۔

چنانچہ شوکت صاحب کی فرمائش رفتہ رفتہ فہمائش کی حد تک پہنچی۔ اور آزردگی پر ختم ہونے والی ہی تھی کہ میں بھی چونکا، دیکھا تو پانی سر سے گذر چکا ہے۔ تعطیلیں ختم ہوچکی ہیں اور کچھ لکھنا تو در کنار۔ پڑھنا اور سوچنا بھی ناممکن ہوگیا ہے۔ لیکن ان باتوں کو خاطر میں کون لاتا

ہے۔ شوکت صاحب میرے بڑے عزیز دوست بھی لیکن میرے ہاتھوں ان کی دوستی کا جو حال ہوا ہے، اس سے میں یہ کیسے مان لوں کہ وہ مجھے معاف کردیں گے۔ اور اب تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں جو کچھ لکھوں گا اسے بھی وہ معاف نہ کریں گے۔

قبل اس کے کہ میں کچھ عرض کروں، ایک بات میرے ذہن میں آتی ہے جس کا اظہار کردینا میں ضروری سمجھتا ہوں اول تو یہ کہ میرے اکثر دوستوں بزرگوں اور عزیزوں نے میرے ساتھ تصویریں کھنچوائیں لیکن خود مجھے وہ تصویریں کبھی دیکھنے کو نہ ملیں، میں نے اس واقعہ کی تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ یا تو میری تصویر اچھی نہیں آئی تھی یا میں نے اپنی شرکت سے اپنے آس پاس والوں کی تصویر خراب کردی تھی۔ اس لئے اس گروپ ہی کو گول کر دیا گیا۔ اسی طرح دوستوں بزرگوں اور عزیزوں نے اپنے اپنے مجموعہ ہائے نثر و نظم پر مقدمے بھی مجھ سے خوب خوب لکھوائے لیکن کچھ دنوں بعد جب کتاب چھپ کر آئی تو معلوم ہوا کہ میرا مقدمہ چھپنے سے رہ گیا۔ دریافت حال پر معلوم ہوا کہ بعض مصالح کی بنا پر مقدمہ کا شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ اس مضمون کا کیا حشر ہونے والا ہے، بایں ہمہ لکھنا تو پڑ ہی رہا ہے، انجام کچھ بھی ہو۔

شوکت صاحب کے مضامین کے کم و بیش سارے مجموعے شائع اور مقبول عام ہو چکے ہیں "موج تبسم"، "بحر تبسم"، "سیلاب تبسم" اور "طوفان تبسم"، ہاں ایک بات اور یاد آئی، شوکت صاحب نے یہ بھی فرمائش کی تھی کہ اس مجموعہ کا کوئی نام بھی تجویز کر دو۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں میرا گذر چاندنی چوک دہلی میں ہوا۔ ایک جگہ سائن بورڈ پر نظر پڑی "چھیل ہی چھیل"، اچھل پڑا، چھیل کا لفظ اتنا قریب ہو تو اچھل پڑنے کے محل استعمال پر نظر ثانی کر لینا چاہئے تھا لیکن بربر اولاد آدم لاحول ولا قوۃ) میں نے فوراً ہی شوکت صاحب کو لکھا کہ "تبسم ہی تبسم" کیسا رہے گا۔ لیکن شوکت صاحب نے "دنیائے تبسم" ہی موزوں سمجھا۔ میں کیا کرتا۔ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ "چھیل ہی چھیل" اور "تبسم ہی تبسم" کے بعد اپنا سا منہ لے کر رہ جانے کا محاورہ بھی یہاں کچھ نامناسب نہیں معلوم ہوتا ہے لیکن کیا کیا جائے اب تو یہ چیز بندھ ہی گئی۔ آخر ہمارے اردو شعرا بھی تو

ایسے مواقع پر بھی کرنے آئے ہیں۔ اُن کا لوگوں نے کیا کرلیا۔

میرا خیال ہے کہ ناموں کے انتخاب میں شوکت صاحب نے اپنی فطری کسرنفسی سے کام لیا ہے، ان کے رنگ کی ترجمانی تبسم سے نہیں ہوتی اور ممکن ہے یہی سبب ہو کہ انہوں نے غیر شعوری طور پر تبسم کے ساتھ 'سیلاب' اور 'طوفان' کی ترکیبیں روا رکھیں، حالانکہ مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تبسم کا سیلاب یا طوفان بالکل متضاد نہ سہی، خلاف آہنگ ضرور ہے۔ اتنا لکھنے کے بعد مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ میں بعض باتیں قبل از وقت کہنے لگا ہوں اس لئے اسے تو میں فی الحال یہاں ختم کر دیتا ہوں۔ اور دو چار دوسری باتیں عرض کرتا ہوں۔

میں عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ طنز و ظرافت کی ابتدا، ایک طرح کی سب و شتم یا پھکڑ اور پھبتی سے ہوئی ہے، ابتدائی چھینٹے روم اور یونان کی رسوم و عبادات کی تاریخ کے اولین اوراق میں جہاں تہاں ملتے ہیں۔ لیکن مشکل اور مصیبت یہ ہے کہ ہمارے شاعر اور ادیب آج بھی طنز و ظرافت میں تاریخ کے انھیں ابتدائی اوراق سے سبق لیتے ہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ہمارا تمدن ترقی کرتے کرتے وہیں پہنچ گیا ہے جہاں اس کی ابتدا ہوئی تھی لیکن یہاں میں تاریخی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ ہم اس حقیقت کو سمجھتے ہیں لیکن اس پر عمل کرنا نہیں چاہتے، اور شاید عمل کر بھی نہیں سکتے۔ کہ ظرافت نگاری کا مقصود بالذات صرف ہنسانا ہی نہیں ہوتا۔ یہی نہیں بعض مسخرے تو ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو ہنسانے سے پہلے خود قہقہے لگاتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں سننے والے کو رونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ یا پھر کوئی ایسا منچلا بھی نکل آتا ہے جو اس قسم کی حرکت پر ہنسانے والے کو زدوکوب کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ بعض ظرافت نگار ہم میں ایسے بھی موجود ہیں جو تلخ یا گہری بات کو ہنسی ہنسی میں جتا دیتے ہیں اور سننے یا پڑھنے والے کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اس نے کیا سنا اور کیونکر متاثر ہوا اس قسم کے کہنے والے بالعموم طنزیات سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ جس کے اردو شاعری میں اکبر مرحوم

امام تھے، جن کے بارے میں اقبال نے آخری بات کہہ دی ہے۔

گہے گریۂ او چو ابر بہارے گہے خندۂ او چو تیغ اصیلے

ہر قوم اپنے تمدنی عروج کے اعتبار سے مختلف مدارج پر فائز ہوتی ہے۔ اور ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا ہے الا خال خال کہ ایک اعتبار سے وہ نہایت درجہ متمدن ہو اور دوسرے اعتبار سے غیر متمدن۔ یہ ستم ظریفی بھی ہم ہندوستانیوں ہی کے حصہ میں آئی ہے، شخصی اور جماعتی اعتبار سے ہماری قوم خاصی متمدن قوم ہے لیکن شعر و ادب کی وادی میں پہنچ کر ہم اکثر گمراہ ورنہ واماندۂ راہ ہو گئے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا شعر و ادب ابھی پورے طور پر مکمل نہیں ہوا ہے، طنز و ظرافت کا فن نہایت مشکل ہے نہایت خطرناک بھی۔ معمولی یا گھٹیا ظرافت ایسا حربہ ہے جس سے اس شخص کو کم نقصان پہنچتا ہے جس پر حملہ کیا جائے، بلکہ اس کی سب سے کاری ضرب خود اس شخص پر پڑتی ہے جو اس حربہ سے حملہ آور ہوتا ہے۔ سب سے کاری اور سب سے مکمل وہ طنز یا ظرافت ہوتی ہے جو غیر شعوری طور پر برسر کار آ جائے۔ اور یہ تمیز کرنا دشوار ہو جائے کہ مقصود طنز یا ظرافت تھی یا تلقین حقیقت۔ یہ بات بڑی دیر میں آتی ہے اور بہت کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہے لیکن بجائے خود یہ بات جتنی مشکل ہے اتنی ہی دلکش ہے اور اس فن کی شاید یہ آخری منزل بھی ہے۔ اس کی مثال اردو میں قاضی عبدالغفار کے ہاں ملتی ہے۔ ان کے لیلیٰ کے خطوط میں تھوڑی بہت۔ نقش فرنگ میں بدرجۂ اتم۔ اور مجنوں کی ڈائری میں بالکل نہیں۔

طنزیین میں بھی کئی گروہ ہیں۔ اور ان کے مسالک بھی جداگانہ ہیں۔ بعض میں جوش ہیجان و طغیانی ہے۔ بعض میں تلخی و زہرناکی بعض میں شگفتگی و دلربائی۔ ادبیات قدیم میں ان کے علمبردار ہوریس، جوونل، اور پرسی اس تھے۔ ہمارے شعر و ادب میں ابوالکلام عبدالماجد اور اکبر مرحوم ہیں۔ اس موضوع پر بالتفصیل میں نے علیحدہ بحث کی ہے اور یہ

نہیں چاہتا کہ شوکت صاحب کی دنیائے تبسم کو اس قسم کی بحث سے گرانبار کروں۔

شوکت صاحب کو ممکن ہے یاد ہو کہ میں نے ایک بار ان سے عرض کیا تھا اور غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب میں میڈیکل کالج لکھنؤ میں صاحب فراش تھا اور شوکت صاحب مجھے اکثر دیکھنے آیا کرتے تھے۔ ان کی مہربانی و مروت میرے دل میں اب تک تازہ ہے۔ میں نے کہا تھا کہ شوکت صاحب آپ نے تحریر کا جو انداز اختیار کیا ہے اس کے بارے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ روزمرّہ کی دنیا میں جو چاہے دیکھیے، سنیے لیکن کہتے وقت اس دنیا میں چلے جایا کیجیے۔ جو تماشا اور تماشائی دونوں سے الگ ہو اور تنہا آپ کی ہو۔ حالات و حوادث آپس میں اور دوسری چیزوں سے بھی اتنے ملے جلے یا گڈمڈ ہوتے ہیں کہ ان کو جوں کا توں بیان کر دینے سے نہ تو وہ اپنے اصلی خد و خال میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اور نہ ان میں کوئی لطافت یا جاذبیت ہوتی ہے۔ سننے یا پڑھنے والے اسی وقت مسرور یا متاثر ہوتے ہیں جب آپ ان کو حالات اور واقعات کی سیر اس طور پر کرائیں کہ وہ ہر چیز کو اس کے اصلی رنگ و آہنگ میں دیکھ یا سن سکیں۔ مثلاً راگ یا رنگ کو لے لیجیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ راگ یا رنگ سے اس طور پر متاثر ہونا کہ کون گا رہا ہے یا کونسا پھول ہے۔ راگ و رنگ کی ناقص تعبیر ہے۔ اصل چیز راگ و رنگ ہے نہ کہ ان کے بعض سطحی مظاہر وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ باتیں شوکت صاحب کو بھائیں گی نہیں۔ وہ کہیں گے کہ یہ فلسفہ کی بدتوفیقی ہے یا تصوف کی فریب کاری میں بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ نوجوانوں سے اس قسم کی باتیں نہ کرنی چاہئیں۔ لیکن اس سے غالباً شوکت صاحب بھی اتفاق کریں گے کہ فن جنس یا عمر کی گراں باری سے آزاد ہوتا ہے اور اس کو آزاد رہنا چاہئے۔ فن کی نہ کوئی جنس ہے اور نہ عمر اور یہی سبب ہے کہ اس کے تنوعات کے مظاہر بے پایاں ہیں۔ اور وہ فن کار کی انتہائی استعداد اور اس کی بلند یا نازک ترین پرواز تخیل سے ہمعناں اور ہمکنار رہتا ہے۔ وہ صرف

کائنات ہے، زمان و مکاں سے ماورا، سب سے برتر، سب پر محیط۔ لیکن یہ بات بھی کچھ یونہی سی رہی۔ یعنی وہی فلسفہ اور تصوف والی جس سے میں شوکت صاحب کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

خیر۔ اسے جانے ہی دیجئے۔ جہاں تو من شدی من تو شدم، کا گزر نہ ہو وہاں تو تو میں میں ہی سہی۔ شوکت صاحب گھریلو ظرافت کے بڑے دلدادہ ہیں، اس کے ماہر بھی۔ یہاں گھریلو سے مراد سطحی یا ادنیٰ قسم کی باتوں سے نہیں ہے۔ گھریلو سے میری مراد خانگی زندگی سے ہے۔ شوکت صاحب اپنے قریبی رشتہ دار مثلاً بیوی بچے۔ بھائی بھاوج یا پھر بعض بے تکلف روز کے ملنے والے دوستوں اور ساتھیوں پر بہت جری ہیں ان کی خوب خوب خبر لی ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس وادی میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس معاملہ میں شوکت صاحب کے حریف چغتائی اور ملا رموزی بھی ہیں یہ بات اچھی بھی ہے اور بری بھی اور بڑھ جانے پر بہت ہی بری جس کا نمونہ ملا رموزی ہیں۔ ان کی ہر قسم کی ظرافت یا اس قسم کی تحریر پروپگنڈے ملوث ہو کر کچھ سے کچھ ہو گئی ہیں۔

میں نے ابھی ابھی کہیں ذکر کیا تھا کہ ظرافت اور طنز کو کائناتی پس منظر میں رکھنا بہت ضروری ہے چہ جائیکہ پس منظر ذاتی حالات و حوادث کی زد میں آجائے۔ ملا رموزی جن حالات و حوادث کو اپنی طنز و ظرافت کا ہدف بناتے ہیں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہدف ملامت محض اس لئے بنائے گئے ہیں کہ خود ملا رموزی ان میں مبتلا ہیں ورنہ وہ حالات و حوادث کبھی اس قابل نہ تھے کہ ان کے خلاف طنز و ظرافت کا حربہ استعمال کیا جاتا۔ وہ غربت فلاکت ناکسی و کس مپرسی وغیرہ وغیرہ کے اس لئے شاکی ہیں کہ وہ خود ان میں مبتلا ہیں۔ ورنہ ان کے عقیدے میں یہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ ان کو ہدف ملامت بنایا جائے۔ اس قسم کی کمزوریوں کا شمار طنز و ظرافت کی شریعت میں کبائر میں ہوتا ہے۔ جو شخص اپنی درماندگی کی حرمت نہ قائم رکھ سکے اس کو طنز و ظرافت کی وادی میں قدم نہ رکھنا چاہیئے۔ شوکت صاحب کو سوجھتی بہت اچھی ہے لیکن سوجھنے اور سمجھانے میں فرق ہے۔ ممکن ہے کسی کو سوجھتی اچھی ہو لیکن

سوجھانے میں وہ قطعاً ناکامیاب رہے ہیں۔ سودیشی ریل گاڑی میں شوکت صاحب نے سوجھنے سوجھانے دونوں میں کمال کر دیا ہے اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ شوکت صاحب کی سودیشی ریل گاڑی نے انھیں جس منزل اور منزلت پر پہنچا دیا ہے اس پر بڑے بڑوں کی بھی نظر رشک سے پڑے گی۔ "کانگرس" کا بھی یہی درجہ ہے۔ ہماری زندگی ہمارے تمدن، ہمارے سیاسی رجحانات، ہمارا عزم و عمل لکھنؤ کی فضا، ہندوستان کی ذہنیت کا ایسا بدیع نقشہ کھینچا ہے کہ شوکت صاحب کا سخت سے سخت ناقد بھی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شوکت صاحب کی زبان اچھی ہے اور بیان بہت اچھا۔ اس موقع پر بعض لوگ کوثر و تسنیم کا لفظ استعمال کئے بغیر نہ رہتے لیکن محض اس ڈر سے کہ آجکل ہماری انشاپردازی پر سب سے بڑا جرم یہ لگایا جاتا ہے کہ ہم عرب و فارس و ترکستان وغیرہ سے لائے ہوئے تشبیہ و استعاروں کے بڑے دلدادہ ہیں میں کوثر و تسنیم کے الفاظ سے ہاتھ دھوتا ہوں اور اپنے دوستوں کی خاطر یہ کہوں گا کہ شوکت صاحب کی زبان و بیان میں وہی لطف ہے جو لکھنؤ کی بالائی اور گھلیوں میں ہے۔ شوکت صاحب نے لکھنؤ کی زبان میں پورب کے بعض خاص الفاظ اور لہجے بڑے لطف و لطافت سے سموئے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے فقرے شعر و ادب کا مزا دے جاتے ہیں۔ ان کے مضامین میں لکھنؤ کے تمدن اور وہاں کی روزانہ زندگی کے بعض بڑے مزیدار نمونے ملتے ہیں ایسے نمونے جو کسی اور نقاتوی کو بمشکل نصیب ہو سکتے ہیں۔ بے موقع نہ ہوگا اگر ان میں سے بعض بعض کا تذکرہ یہاں کر دیا جائے مثلاً۔

۱۔ کانگریس کی صدارت لکھنؤ کے ایک نواب صاحب کر رہے ہیں۔ بہت کچھ تکلف و تعظیم کے بعد جناب صدر صاحب خطبہ صدارت پڑھنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں۔ شوکت صاحب فرماتے ہیں

"آپ نے سب سے پہلے تو اپنا بٹیر اپنے خدمتگار کو دیا۔" !

۲۔ ایک مقام پر تکیہ کا غلاف بنانے کا مسئلہ درپیش ہے۔ بھائی اور بھاوج میں حجت

ہو رہی ہے شوکت صاحب فرماتے ہیں "یہی غلاف باعث موازنہ انیس و دبیر بن جاتا"

۳۔ لکھنؤ اور لاہور کے موازنہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں "ہم کو طائرانہ نظر سے مقابلہ کرنے کے لئے پہلے عمارتوں پر منڈلانا چاہیئے اس کے بعد شہر کی گلی کوچوں پر اڑنا چاہیئے پھر دونوں شہروں کے باشندوں کی ترکیب نحوی کرنا چاہیئے اور آخر میں دونوں کی عام حالت لکھ کر یہ کہدینا چاہیئے کہ یہ بھی جیئے اور وہ بھی جیتے، جیسے ان دونوں کے دن پھرے خدا سب کے پھیرے "۔

۴۔ ایک ڈاکٹر کی خستہ حال موٹر کا خاکہ کھینچا ہے "وہ موٹر ضرور تھا اور اگر اس میں پیٹرول ڈال دیا جاتا تھا تو چلتا بھی تھا، یہ اور بات ہے کہ آواز و رفتار کے اعتبار سے وہ کسی لاری اور چھکڑے کی سول میرج کی زندہ یادگار نظر آتا تھا"۔ انھیں ڈاکٹر صاحب اور مالک مکان کا تذکرہ کرتے ہوئے جس کے مکان میں ڈاکٹر صاحب کرایہ ادا کرکے رہتے تھے۔ مالک مکان کے باب میں لکھتے ہیں "مکان دار نے کچھ نامناسب طریقہ پر دروازہ پر کچھ غیر طبی کلمات کہے"۔

۵۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی کے درمیان گفتگو ہوتی ہے۔ بیوی سمجھتی تھیں کہ ڈاکٹری میں بڑی آمدنی ہوتی ہے انھوں نے اپنے اس خیال کا ثبوت یہ دیا کہ ڈاکٹر آخر دن رات موٹر میں کہاں کہاں پھرا کرتے ہیں۔ شوکت صاحب (یا ڈاکٹر صاحب) جواب دیتے ہیں "یہ لوگ فضول بھی اپنے موٹر کو ادھر ادھر دوڑاتے رہتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ ڈاکٹری چل رہی ہے حالانکہ محض موٹر چلتا ہے"۔

۶۔ ایک مقام پر ڈاکٹر صاحب بہت زچ ہوئے ہیں۔ شوکت صاحب نے ان کا برزخ یوں پیش کیا ہے۔ "ڈاکٹر صاحب نے اپنے چہرہ پر خطرہ کی زنجیر لٹکاتے ہوئے کہا۔"!

یہ چند مثالیں میں نے جہاں تہاں سے اخذ کرلی ہیں۔ ورنہ دنیائے تبسم میں انکے

جگہ جگہ ایسے دلچسپ اور بقول بعض مشاعرہ والوں کے "بھرپور" مصرعے کافی تعداد میں ملتے ہیں۔

ابھی چند دنوں کی بات ہے ایک رات میں شوکت صاحب کی وہ تقریر سن رہا تھا جو انھوں نے ایک افیونی کے جنت کی تخیل پر کی تھی۔ ایک افیونی اپنے کسی مرحوم دوست سے جنت میں ملتا ہے اور جنت کے تمام لطائف و ظرائف کو مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ جہاں تک ریڈیو کا تعلق ہے ان کی تقریر یقیناً کامیاب تھی اور غالباً یہ بہانہ یا مجبوری بجائے خود ایک ایسی چیز ہے جس کو مدنظر رکھ کر اس تقریر پر فنی رائے زنی بے سود اور بے محل دونوں ہے لیکن شوکت صاحب میرے چھوٹے ہیں۔ فنی پیشہ یا رتبے کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس اصول کے ماتحت جو مشرق میں خوردوں بزرگوں کے باہمی تعلقات پر حاوی ہوتا ہے۔ اس تقریر کے بارہ میں شوکت صاحب سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ صاحبِ فن اس مبحث پر ایک دوسری نوعیت سے اظہار خیال کرتا۔ افیونی کو ممکن ہے بہشت میں گنے، دودھ، فرینی، سوہن حلوا ہی نظر آتا ہو یا ملتا ہو لیکن افیونی اور افیونی کے وکیل کے نقطۂ نظر میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ جنت میں واقعات سے نہیں نقطۂ نظر سے بحث کرنا چاہیے۔ افیونی کی مرغوب خاطر نعمتیں اور چیز ہے اور افیونی کی شریعت دوسری چیز ہے۔ یہ بحث بڑی طویل ہے بصیرت افروز اور دلچسپ بھی لیکن یہاں اس کا موقع نہیں ہے ورنہ اس

دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

پھر کیا کچھ نہیں کہا جا سکتا

ہاں شوکت صاحب ایک بات اور سُن لیجئے اور گو یہ کان میں کہنے کی ہے لیکن خیر کوئی حرج نہیں گوش ہم دیوار دارد!

ہماری یہ کائنات ظرافت کی تاریخ کا اولین اور سب سے اہم باب ہے۔ ملائک کی تخلیق سے جب Comedy of Errors (بھول بھلیاں) فرسودہ اور بے مزہ

ہونے لگی تو مشیت الٰہی نے اس میں طنز کا عنصر بھی شامل کر دیا اور ان بزرگ کو عالم وجود میں لایا گیا جن کو ہمارے بزرگ شیطان کہتے ہیں۔ چنانچہ بقول امیر مینائی مرحوم جن کا پورا شعر مجھے یاد تو ہے لیکن ممکن ہے موزوں یاد نہ ہو اور میں نے بعض بڑی جان جوکھوں قسم کے استادوں کو بھی اسے ایسا ہی پڑھتے ہوئے سنا ہے جیسے کہ یہ شعر ناموزوں ہی موزوں ہو گیا تھا۔ پانی کی چار بوندیں جو کبھی انگور میں تھیں کھنچیں تو تلوار بن گئیں اور ظرافت ستم ظریفی میں تبدیل ہو گئی نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہماری کائنات وہ چیز بن گئی ہے جس پر میں آسانی سے اظہار خیال کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے ڈر ہے آپ اسی آسانی کے ساتھ اسے شایع نہ کر سکیں گے۔ اس لیے میں اس بحث کو یہیں ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے امید ہے اس کی بصیرتوں سے آپ کبھی نہ کبھی ضرور فیضیاب ہوں گے،

اچھا شوکت صاحب خدا حافظ، میری دعا ہے کہ آپ پر وہ مصیبت نازل نہ ہو جس نے انشا ایسے بے پناہ کو بھی بدحواس کر دیا تھا۔ ہر روز ایک نیا لطیفہ دریافت کرنا ممکن ہے آپ کے نزدیک اتنا دشوار نہ ہو جتنا کہ میں سمجھتا ہوں لیکن احتیاط شرط ہے۔ دنیائے تبسم میں سرپنچ کے ایڈیٹر کو کہاں جگہ ملے گی مجھے نہیں معلوم۔ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جیسٹرٹن بھی اسی وادی پُرخار سے گذرے تھے ان کے دامن سے تو کانٹوں ہی کو گزند پہنچا۔ خدا کرے آپ کے دامن کو کانٹے گزند نہ پہنچائیں۔

رشید صدیقی

دنیا کی بات

میرے مضامین کا یہ پانچواں مجموعہ آخر کیوں شائع ہو رہا ہے؟ قسم لے لیجئے جو اس سوال کا جواب خود مجھ کو معلوم ہو۔ البتہ اس سلسلہ میں آپ برادرم خواجہ اظہر عباس صاحب بی۔ اے نبیرۂ خواجہ الطاف حسین صاحب حالی علیہ الرحمۃ سے براہ راست خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ جو اس مجموعہ کی اشاعت کے سولہ آنے محرک اور سولہ آنے سے بھی کچھ زیادہ ذمہ دار ہیں۔ البتہ اس مجموعہ کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں میری ہیں ان سے میں سبکدوش ہوتا چاہتا ہوں۔

(۱)۔ اس مجموعہ کا مصنف میں ہوں۔ اور سرورق پر میرا نام ہے۔ خدا مجھے معاف کرے

(۲) اس مجموعہ کا مقدمہ لکھنے کی تکلیف میں نے برادر محترم پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو دی۔ خدا کرے کہ وہ مجھ کو معاف کر دیں۔ اور عاقبت میں دامن گیر نہ ہوں۔

(۳) اس مجموعہ میں چار پانچ مضامین وہ ہیں جو دہلی ریڈیو اسٹیشن سے میں نشر کر چکا ہوں مثلاً پروفیسر، مکھیاں، میں ایک بے روزگار ہوں اور ڈاکٹر۔ ان مضامین کے لئے میں نے خاص طور پر ریڈیو اسٹیشن دہلی سے اجازۂ اشاعت حاصل کر لیا ہے۔ امید ہے کہ اب اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب کو معاف کرنے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔

(۴) اس مجموعہ کے وہ مضامین جو مختلف اخبارات یا رسائل میں شائع ہو چکے ہیں یا وہ مضامین جو ریڈیو نواز حضرات سن چکے ہیں یقیناً دنیائے تبسم خریدنے والوں کے لئے نئے نہ ہوں گے۔ مگر امید ہے کہ وہ فیاضانہ رواداری سے کام لیں گے۔

(۵) اس مجموعہ کے لئے میں نے دو ایک نئے مضامین لکھے ہیں۔ جو اب تک کہیں شائع نہیں ہوئے۔ امید کہ آپ حضرات میرا شکریہ ادا کرنے میں بخل سے کام نہ لیں گے اور عدیم الفرصتی کا عذر نہ کریں گے۔

اب وہ ذمہ داریاں ہیں جن کا تعلق اس خاکسار سے نہیں ہے۔

(۱) دنیائے تبسم کی طباعت اگر اچھی ہو تو اور بری ہے تو بہ اہتمام منیجر صاحب مطبع ہذا سے تبادلۂ خیالات کیجئے

(۲) دنیائے تبسم کا کاغذ جیسا کچھ بھی ہے۔ اس کے جواب دہ خواجہ اظہر عباس منیجنگ ڈائرکٹر حالی پبلشنگ ہاؤس ہیں۔

(۳) دنیائے تبسم کا سرورق کیسا ہے؟ یہ سوال میں مسٹر اویاما ogamao کی طرف سے کر رہا ہوں اس لئے کہ یہ ان ہی کے موقلم کا نتیجۂ فکر ہے۔

(۴) "دنیائے تبسم" نام میرا رکھا ہوا نہیں ہے۔ ہمشیرہ عزیزہ زہرہ سلمہا ہمشیرہ خواجہ اظہر عباس صاحب نے نام تجویز کیا ہے۔ اور شوکت دلھن نے اس کی تائید کی ہے۔ پھر رشید صاحب صدیقی نے اس پر مہر تصدیق ثبت کی گویا دو تو بھاوج اور تیسرا ایک ذمہ دار یونیورسٹی کا مسلم الثبوت استاد اس نام کے ذمہ دار ہیں۔ اور بندہ اس تثلیث سے علیحدہ۔

(۵) قیمت زیادہ ہو تو خواجہ اظہر عباس صاحب پر دعویٰ کیجئے اور اگر کم ہو تو بقیہ دام بھی ان ہی کے نام روانہ کر دیجئے۔ شکریہ کے ساتھ قبول کر لیں گے۔

(۶) جلد اگر آپ کو پسند نہ آئے تو خواجہ اظہر عباس صاحب کے خلاف ایک آدھ مضمون اخبارات میں نکلوا دیجئے۔ اب ایک ضروری اعلان ہے۔ امید ہے کہ تمام حضرات اس کو گرہ میں باندھ لیں گے۔ وہ اعلان یہ ہے کہ براہ کرم کوئی صاحب یہ مجموعہ اس خاکسار سے بطور ہدیہ محقر یا نذر خلوص یا بغرض تبادلہ و تبصرہ یا بربنائے محبت و مروت مختصر یہ کہ کسی ایسی صورت سے جس کا تعلق وی۔ پی یا منی آرڈر یا دست بدست والے معاملات سے نہ ہو طلب نہ کریں۔ البتہ "حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی" سے سرقہ کرنے کے لئے وہ ہر وقت آزاد ہیں۔ اور تھانہ حوض قاضی کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ رہ گئے وی۔ پی طلب کرنے والے حضرات یا منی آرڈر ارسال کرنے والے بزرگ یا اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کا سودا کرنے والے کرم فرما بخدا ان کی عزت جتنی ہمارے دل میں ابھی سے ہے اس کو ہم الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ زیادہ حد ادب۔

بدنام تبسم
شوکت تھانوی

سر پنج جرنلس لکھنؤ
(یکم دسمبر ۱۹۳۷ء)

۱

مقروض

ہم آپ سے کیا عرض کریں کہ کس قدر لاجواب چیسٹر تھا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ دل لوٹ کر رہ گیا۔ ایک ہمارا چیسٹر ہے، خدا کی مار اس چیسٹر پر، معلوم ہوتا ہے کہ کسی مرحوم انگریز کا ترکہ ہم کو ملا ہے۔ یا گدڑی بازار سے خرید کر لائے ہیں۔ اب تو خیر اس چیسٹر کو ایک زمانہ ہو گیا۔ مگر جب یہ بنا تھا اس وقت بھی اس میں کوئی دلفریبی اور کوئی جاذبیت نہ تھی۔ اور اسی وقت یہ کم بخت کسی گورے کی اترن معلوم ہوتا تھا۔ مگر نیاز کا چیسٹر کیا کہنا، دیکھئے تو دیکھتے رہ جائیے۔ کس قدر عمدہ اور ساتھ ہی ساتھ ملائم کپڑا ہے۔ اون ہے مگر مخمل معلوم ہوتا ہے۔ پھر ہمارے چیسٹر کی طرح تین گدھوں کا بوجھ بھی نہیں۔ رنگ اس قدر خوبصورت کہ سبحان اللہ۔ گہرا فاختئی رنگ کچھ کاسنی جھلک لئے ہوئے اور نہایت لطیف قسم کی چمک بھی، اس پر چھوٹے چھوٹے گنجان رونگٹے۔ ہمارے چیسٹر کی طرح نہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی خچر کو خارش ہو گئی ہے۔ بہر حال نیاز کا چیسٹر دیکھ کر ہم اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گئے، اور باوجود اس احساس کے کہ ہم سخت بدتمیزی کر رہے ہیں۔ ہم سے نہ رہا گیا۔ اور اس کے چیسٹر کے کالر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"کیا پیارا کپڑا ہے۔ اور کس قدر خوبصورت رنگ؟"

نیاز نے کسر نفسی کے ساتھ ہنس کر خود اپنے چیسٹر کو دیکھا۔ اور خاموش ہو گیا۔ ہم

نے کپڑے کی دَبازت کا اپنی چٹکیوں سے اندازہ کرتے ہوئے کہا، کہاں سے مار لائے یہ کپڑا۔ نہایت لاجواب ہے۔

نیاز نے لاپروائی سے کہا: "کپڑے کی تعریف نہ کرو۔ میرے حسنِ انتخاب کی داد دو۔"

ہم نے کہا۔ "بے شک، بے شک تمہاری خوش مذاقی کا صرف اس چسٹر سے پتہ چلتا ہے۔"

نیاز نے کہا۔ "یہ کپڑا میں نے دو ڈھائی سو چسٹر کے کپڑوں میں سے انتخاب کیا تھا۔"

ہم نے کہا۔ "آو ہے کیا حساب؟"

نیاز نے کہا۔ "خیر داموں کی تو کوئی پروا نہیں، مگر چیز اچھی ہونا چاہیئے۔"

ہم نے کہا۔ "پھر بھی؟"

نیاز نے کہا۔ "یہ پچیس روپے گز ہے اور ڈھائی گز میں چسٹر ہوتا ہے۔ گویا ساڑھے باسٹھ روپے کا تو ہوا کپڑا۔ اور پچیس روپے اس کی ہوئی سلائی مع تمام سامان کے!"

ہم نے منہ کھول کر کہا۔ "ساڑھے باسٹھ روپے کا کپڑا ہے صرف ایک چسٹر کا؟"

نیاز نے اپنے چسٹر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "پھر چیز بھی تو ہے کہ ع

اسے جو دیکھ لیتا ہے وہ شیدا ہو ہی جاتا ہے

ہم نے کہا۔ "اور سلائی پچپن روپے؟"

نیاز نے کہا۔ "یوں تو چسٹر کی سلائی آٹھ روپے بھی ہوتی ہے۔ مگر دیکھیے تو سہی کہ ظالم نے گویا تصویر کھینچ دی ہے۔ پورا چسٹر ہاتھ سے سیا ہے اور سامان دیکھیے کتنا عمدہ لگا ہے۔ ریشمی تو لائننگ ہے۔ بٹن خاص پیرس کے ہیں، پھر بلٹ میں جرمن سلور کا بکسوا لگایا ہے۔ ٹانگنے کے لئے یہ زنجیر لگائی ہے۔ صرف اسی کی قیمت آٹھ آنے ہوگی۔"

ہم نے کہا۔ "تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ کوئی دس کم سو روپے کا نسخہ ہے؟"

نیاز نے کہا۔ "ہاں اتنے ضرور لگ جائیں گے۔ مگر یہ بتائے دیتا ہوں کہ اگر یہ کپڑا لینا ہے تو سلوانا بھی براؤن اینڈ ڈوہرلی کے یہاں۔ چسٹر کا اسپیشلسٹ ہے۔"

ہم نیاز کے اس چسٹر کا تخمینہ سن کر چپ ہو گئے۔ اس لئے کہ جو حساب لگا تھا وہ دس کم ہماری تنخواہ بابت ایک ماہ کے برابر ہوتا تھا۔ اور اس کے معنی یہ تھے کہ اگر ہم مع اہل و عیال کے ایک ماہ تک مقاطعہ جوعی کریں تو یہ چسٹر بن سکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ اس وقت ہم کو اپنی غربت کا احساس نہایت شدت کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اور اس چسٹر کے لئے دل کچھ ایسا مچلا تھا کہ لاکھ دل کو بہلاتے تھے اپنی توجہ دوسری طرف مبذول کرتے تھے۔ شعر کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ مضمون کے لئے دماغ لڑاتے تھے۔ مگر سوائے اس کافر چسٹر کے اور کوئی خیال ہی ذہن میں نہ آتا تھا۔ نیاز سے رخصت ہوتے

کے بعد سے بار بار پروگرام بنایا کہ اس سلسلہ میں بیوی سے نہایت سنجیدگی کے ساتھ مشورہ کریں گے، اور اپنے ایک آدھ دوست سے اس مسئلہ کے متعلق رائے لیں گے لیکن یہ تمام باتیں غور کرنے کے بعد بیکار محض ثابت ہوئیں اس لئے کہ اس سلسلہ میں کسی سے ہمدردی کی کوئی امید نہ تھی۔ آخرکار بہت کچھ غور کرنے کے بعد ہم نے کاغذ اٹھا کر اپنے ایک نہایت ہی ہمدرد اور چار پیسے والے ایک دوست کو خط لکھا کہ:-

اشد ضروری

برادرم۔ السلام علیکم۔ ابھی جون پور سے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ ہمشیرہ عزیزہ نہایت خطرناک طور پر علیل ہے، یہ تار پاتے ہی میں سخت بدحواس ہو گیا ہوں۔ اور اسی وقت کی ٹرین سے مع اہل و عیال کے جون پور جا رہا ہوں بینک کا وقت نکل گیا ہے۔ لہٰذا حامل رقعہ کے ہاتھ سو روپیہ بھیج دیجئے۔ جون پور سے واپسی پر فوراً بھیج دوں گا۔ میرا شکریہ ابھی سے قبول فرمایئے۔

شوکت

اس رقعہ کو بھیجنے کے بعد ملازم نے ایک موٹا سا لفافہ لا کر دیا جس میں دس دس روپے کے پانچ نوٹ تھے۔ اور خط بھی تھا۔

برادرم۔ وعلیکم السلام۔ خدا کرے آپ اپنی ہمشیرہ کو بخیریت پائیں اس وقت تمام روپیہ بینک بھیج چکا ہوں۔ ایک نجی ضرورت سے یہ پچاس روپے روک لئے تھے۔ حاضر ہیں واپسی پر فوراً ہمشیرہ عزیزہ کی خیریت سے اطلاع دیجئے۔

خادم عبدالعزیز

ہم نے اپنے دل میں کہا کہ پچاس سے تو کام نہ چلے گا، مگر دل نے کہا چلو تو سہی اللہ مالک ہے وہ بڑا مسبب الاسباب ہے، جہاں یہ انتظام ہوا ہے وہاں اور بھی انتظام ہو جائے گا۔ لہذا ہم فوراً یہ روپے لے کر نیاز کے یہاں پہنچے۔ اور جاتے ہی ان سے کہا:۔

"چلئے حضرت کپڑا دلوایئے جسٹر کا اور تیار کرایئے۔"

نیاز نے کہا: "کیا واقعی تم بھی بناؤ گے ایسا ہی جسٹر۔"

ہم نے کہا: "کیوں صاحب آخر اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔" کہنے لگے "کچھ نہیں یوں ہی کہا تھا۔ اچھا ابھی چلتا ہوں۔ ذرا کپڑے پہن لوں۔"

یہ کہہ کر نیاز نے کپڑے پہنے اور اپنا وہی جسٹر کپڑوں کے اوپر پہن کر ہمارے ہمراہ ہو گیا۔ حضرت گنج کی ایک دوکان میں پہنچ کر نیاز نے کپڑا طلب کیا اور جب کپڑا کٹنے کے قریب تھا، ہم نے نیاز کے کان میں کہا، "مگر یار اس وقت میں غلطی سے صرف پچاس ہی روپے لے کر چلا آیا ہوں۔"

نیاز نے چونک کر کہا "پچاس"۔

ہم نے کہا: "کیا عرض کریں غلطی ہو گئی۔"

نیاز نے غور کر کے کہا: "خیر کوئی ہرج نہیں باقی کا بل میں اپنے نام منگا لوں گا۔"

یہ کہہ کر نیاز نے کپڑا لیا۔ اور پچاس روپیہ دے کر دوکاندار سے کہا کہ "ساڑھے بارہ روپے کا بل میرے نام بھیج دینا۔"

کپڑے کی خریداری کے بعد ہم دونوں مع اس کپڑے کے براؤن اینڈ ڈے مرنا

کے درزی خانہ میں پہنچے اور وہاں اپنی پیمائش کرا کے چسٹر سلنے کو دے دیا۔

چسٹر ادھر سلتا رہا اور ادھر ہم چسٹر کے فراق میں انتظار کی گھڑیاں گنتے رہے ایک ایک دن پہاڑ کی طرح کاٹا۔ آخر ایک ہفتہ کے بعد نیاز کا ملازم ایک خط اور چسٹر لے کر آیا۔ ہم نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ اس ملازم کا خیر مقدم کیا۔ اور چسٹر لے کر پہنا۔ خط میز پر رکھ کر چسٹر پہنے ہوئے کمرے میں چلے گئے اور قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے کو دیکھا۔ واللہ اس وقت ہم بہت ہی رئیس معلوم ہوتے تھے۔ سامنے سے کھڑے ہو کر دیکھا تو اپنے اوپر نواب صاحب بھوپال کا شبہ ہوا پھر ذرا گھوم کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ آئینہ میں مہاراجہ اندور کھڑے ہیں۔ دوسری طرف پہلو بدل کر دیکھا تو اپنے عکس پر ڈیوک آف کینٹ کا شبہ ہونے لگا۔ آئینہ کی طرف پشت کر کے اور گردن گھما کر جو دیکھتے ہیں تو چسٹر کی بلٹ نے ہم کو ہز مجسٹی ظاہر شاہ بنا دیا تھا۔

آئینہ کے سامنے سے ہٹ کر اپنے اس دلفریب عکس کو نگاہوں سے دور کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ مگر ہم نے اس موقع پر انتہائی نفس کشی سے کام لیا اور آئینہ کے سامنے سے ہٹ کر کمرہ کے باہر آ گئے۔ اور نیاز کے ملازم سے کہا کہ ”اچھا جاؤ صاحب کو سلام دینا اور کہنا کہ بہت شکریہ ادا کیا ہے۔“

نوکر نے کہا۔ ”صاحب نے خط کا جواب بھی مانگا تھا۔“

ہم نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا ”کیا خط ——— او ہو ——— وہ ہے میز پر میں بھول ہی گیا تھا۔“ اس خط کو کھول کر پڑھا تو اس میں نیاز صاحب رقمطراز تھے کہ:۔

"ڈیر شوکت۔ جیسٹر تم کو ضرور پسند آئے گا۔ مسز شوکت تم پر فخر کریں گی کہ ایسا جامہ زیب شوہر ان کو ملا ہے۔ بہرحال حامل رقعہ کے ہاتھ ساڑھے بارہ روپے کپڑے کے اور پچیس روپے سلائی فوراً بھیج دو، اس لئے کہ میں کبھی اس قسم کا لین دین نہیں کرتا۔ مجبوراً اس روز اس اصول کو آپ کی حماقت کی وجہ سے توڑا تھا۔ بہرحال آج ہی دونوں بلوں کی ادائیگی نہایت ضروری ہے۔

نیاز مند نیاز

ہم نے خط کو پڑھا تو جیسٹر کو پہن کر جو سرور حاصل ہوا تھا وہ کرکرا ہو گیا۔ دیر تک ہم خاموش کھڑے ہوئے اس خط کے کاغذ پر جلترنگ بجاتے رہے اس کے بعد قلم اٹھا کر اسی کاغذ پر لکھ دیا۔

"نیاز۔ جیسٹر بہت عمدہ ہے، اس کے دونوں بل ابھی ادا کر دیتا مگر مسز شوکت اپنی ایک سہیلی کے ساتھ چڑیا گھر چلی گئی ہیں۔ اور تم جانتے ہو کہ خزانچی وہی ہیں ان کے آتے ہی روپیہ بھیج دوں گا۔"

تمہارا شوکت

یہ خط ملازم کو دے کر رخصت کر دیا۔ اور جیسٹر پہنے ہوئے جیسٹر کی نمایاں شان محشر خرامی کے ساتھ ہم گھر کے اندر پہنچ گئے۔ بیگم نے دیکھتے ہی کہا:-

"یہ کس کا پہن آئے؟"

ہم نے کہا۔ "ہمارا ہے اور کس کا ہوتا؟"

بیگم نے ہم کو دروغ باف سمجھتے ہوئے کہا۔ "کہاں سے آیا یہ آپ کا جیسٹر؟"

ہم نے کہا "لندن سے کپڑا آیا۔ اور حضرت گنج سے سل کر ہمارے یہاں آیا ہے، دیکھو تو ہے کیسا"

بیگم نے کہا "ہے تو اچھا مگر قیمتی بہت معلوم ہوتا ہے اس لئے بُرا ہے مگر میں یہ بتائے دیتی ہوں کہ میرے پاس ایک پیسہ بھی اس مد کے لئے نہیں ہے مجھ سے کچھ نہ مانگئے گا"

ہم نے کہا۔ یعنی آپ خواہ مخواہ دہلی اور سہمی جاتی ہیں۔ میں آپ سے خود نہ مانگوں گا۔ اور آپ سے مانگوں کیا۔ آپ قیامت تک تو اس کی قیمت دے نہیں سکتیں۔ معلوم بھی ہے پونے دو سو کا ہے یہ چسٹر"

بیگم نے کہا۔ "سچ بتائیے ہے کس کا؟"

ہم نے کہا "نیاز نے ولایت سے دو چسٹروں کا کپڑا منگایا تھا۔ ایک اپنے لئے۔ ایک میرے لئے، انھوں نے مجھ کو تحفۃً دیا ہے۔ بیگم یہ سنتے ہی اس طرح کھڑی ہو گئیں، گویا اختلاج قلب کے دورے سے یکایک نجات مل گئی، اور ہمارے قریب آکر نہایت غور سے چسٹر کو دیکھ کر بولیں۔ "واقعی ہو گا پونے دو سو کا، بہت عمدہ کپڑا ہے۔ اور سلا ہوا بھی اچھا ہے۔ اب اس کو ذرا احتیاط سے پہنئے گا۔ لائیے میں رکھ دوں ابھی۔ ایسی سردی نہیں ہے"

ہم نے دور ہٹتے ہوئے کہا "یعنی کمال کیا آپ نے سردی اب اس سے زیادہ اور کیا ہو گی، کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو نمونیہ ہو جائے"

بیگم نے کہا۔ سردی تو خیر اب شروع ہوئی ہے اور اگر آپ کو ایسی ہی سردی معلوم ہوتی ہے تو پرانا چسٹر پہنئے"

ہم نے تعجب سے کہا ـــــــ " وہ چسٹر پہنوں خارشی خچر کی کھال، اسے دے دیجئے کسی نوکر کو، مجھ پر تو اب اس کی طرف دیکھا بھی نہ جائے گا!"

بیگم کچھ اور کہنا ہی چاہتی تھیں کہ باہر سے کسی نے آواز دی۔ اور ہم فوراً چسٹر پہنے ہوئے باہر نکل گئے، جہاں عبدالعزیز صاحب کا ملازم ایک خط لے کر آیا تھا۔ اس شخص کو دیکھتے ہی ہم کو چسٹر کے تکلیف دہ ہونے کا احساس ہوا۔ مگر خط لے کر پڑھنا شروع کیا۔

"برادرم۔ السلام علیکم۔ آپ نے ہمشیرہ عزیزہ کی خیریت سے مطلع نہ فرمایا سخت تشویش ہے۔ امید ہے کہ آپ فوراً ان کا حال لکھیں گے۔ دوسری اہم بات یہ عرض کرنا تھی کہ اتفاقاً میرے پاس دو بلٹیاں اس قسم کی آ گئی ہیں کہ میں تمام منتشر روپیہ یکجا کرنے کے بعد شاید کچھ قرض لینے پر بھی مجبور رہوں۔ لہٰذا آپ بھی اس طرف توجہ فرمایئے۔ یہ اتفاقی ضرورت ہے۔ ورنہ آپ کو نہ لکھتا۔"

آپ کا عزیز

ہم خط پڑھ کر جوں کے توں رہ گئے، مگر ہماری اس نازک موقع پر حاضر دماغی ملاحظہ ہو کہ فوراً قلم اٹھا کر لکھ دیا۔

"برادرم۔ وعلیکم السلام۔ ہمشیرہ عزیزہ کی حالت نسبتاً بہتر ہے۔ آپ کے حکم کی تعمیل کل کر سکوں گا۔ اس لئے کہ ملازم کے پاس کنجیاں ہیں اور وہ غائب ہے۔"

شوکت

عزیز صاحب کے خط کا جواب دینے کے بعد تھوڑی دیر تک تو ہم کچھ کھوئے سے رہے۔ مگر چونکہ آج ہی اپنے چسٹر کا تعارف اپنے تمام حلقۂ احباب سے

کرانا تھا۔ لہٰذا "اللہ مالک ہے" کہتے ہوئے اس طلسم خیال کو توڑ کر اُٹھے۔ اور چھتری اٹھا کر چسٹر پہنے ہوئے گھومنے کو نکل گئے، اور رات کو اس وقت گھوم کر آئے جب ہماری چسٹری شان کو دیکھنے کے لئے کوئی بھی بیدار نہ تھا۔ لہٰذا ہم بھی ایک مرتبہ پھر قدآدم آئینہ کے سامنے جا کر اپنے کافر حسن چسٹری کو دیکھنے کے بعد چسٹر اتار کر بستر پر چلے آئے۔

دوسرے دن دفتر جانے سے قبل ایک آدھ مرتبہ چسٹر کو دیکھا۔ دو تین مرتبہ اس پر ہاتھ پھیرا۔ اور اس سے رخصت ہو کر دفتر چلے گئے، اس لئے کہ دھوپ کی تیزی میں اس کو پہننا ہمارے دماغی توازن کو عوام کی نظروں میں مشکوک بنا دیتا مگر دفتر سے واپسی پر چائے اور ناشتہ سے قبل ہی چسٹر سے ملے۔ اور اس پر محبت کا ہاتھ پھیر کر گھر کے اندر گئے، ابھی ہم کو گھر کے اندر آتے ہوئے مشکل سے دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ کسی نے آواز دی، یہ آواز نیاز کے ملازم کی تھی۔ لہٰذا ہم نے فوراً بڑے بچے سے کہا کہ "کہہ دو کہ نہیں ہیں۔"

اس نے برجستہ پکار کر کہا کہ۔ "ابا کہتے ہیں کہ ہم نہیں ہیں۔" ہم نے فوراً اس کا منہ دبوچ لیا۔ اور ملازمہ سے کہلوا دیا کہ نہیں ہیں۔ بیگم نے پوچھا بھی کہ آخر کیوں منہ چرا رہے ہو۔ مگر ہم نے خستگی کا بہانہ کر کے بات ٹال دی اور نیاز کے ملازم کے چلے جانے کے بعد نہایت اطمینان سے چائے پی کر مردانہ نشست گاہ میں آ گئے۔ تاکہ ڈاک دیکھیں اور ڈاک کے جوابات دیں۔ چنانچہ باہر آ کر لیٹر بکس سے ڈاک نکالی اور خطوط پڑھنے کے بعد اخبار کھول ہی رہے تھے کہ نیاز خود بہ نفس نفیس اسی کمرہ کی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ اور ان پر نظر پڑتے ہی ہم خدا جانے کیوں اس قدر

بدحواس ہوئے کہ خطوں کا پلندہ ہاتھ میں لئے ہوئے جھٹ سے الماری کے پیچھے چھپ گئے، جہاں نہایت گھنے مکڑیوں کے جالوں کے علاوہ اس قدر گرد تھی کہ خدا کی پناہ۔ بہرحال یہی نامعقول جگہ اس وقت نہایت معقول ہو رہی تھی۔ اور ہم نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی سانس تک کو روکے ہوئے وہاں چھپے کھڑے تھے۔ نیاز چلمن اٹھا کر کمرہ میں آئے، اور ہر طرف دیکھ کر خود ہی یہ کہتے ہوئے کہ "بدمعاش گھر میں ہوگا" کمرہ سے باہر نکل کر زنانہ مکان کے دروازہ پر آوازیں لگانے لگے۔ اور ان کی ہر آواز کا جواب یہی ملنے لگا کہ باہر ہی گئے ہیں مجبوراً بیچارے تھوڑی دیر تک تو سیٹی بجا بجا کر ٹہلتے رہے اس کے بعد بید گھما کر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے اور یہ یقین کرنے کے بعد کہ اب وہ واپس نہ آئیں گے۔ ہم اس گوشۂ عافیت سے نکلے۔ اور اپنی ہیئت دیکھنے کے بعد چہرے کو ایک عاشقانہ نظر سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا کہ ع

جو نہ کرنا تھا کیا اے دلربا تیرے لئے

اور پھر آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر برش سے اپنے کپڑے جھاڑنے لگے۔ مگر ابھی ہم اپنے نصف جسم کی گرد اور جالے صاف کرنے نہ پائے تھے کہ بھائی عبدالعزیز صاحب کا عکس یکایک آئینہ میں دیکھ کر برش ہمارے ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔ اور ہم نے گھبرا کر گھومتے ہوئے کہا۔ "السلام علیکم"

عزیز صاحب نے ہماری ہیئت دیکھ کر کہا: "خیریت تو ہے، یہ کیا معاملہ ہے، کیا کشتی لڑے تھے؟"

قربان جایئے اس حاضر دماغی کے فوراً ہم نے کہا۔ جی نہیں ابھی عیش باغ

سے آ رہا ہوں۔ جوان۔ ناکتخدا۔ نہایت قابل اور حسین مختصر یہ کہ ہمہ صفت موصوف خالہ کی لڑکی کو توپ کر ——" یہ کہہ کر ہم نے گردن جھکا لی۔ اور قریب تھا کہ رونا شروع کریں کہ عزیز صاحب نے کہا "انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ پر تو یکایک پریشانیوں کا حملہ ہوا ہے، خدا آپ پر رحم کرے۔ اور مرحومہ کو جنت نصیب کرے۔ علالت کیا تھی؟"

ہم نے کہا "علالت —— علالت کی تو مجھ کو اطلاع ہی نہیں ہونے پائی۔ شاید قبل از مرگ ان کو نزلہ ہوا تھا۔ پھر قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ اور آخر کار تپ دق نے جان لی غریب کی۔"

عزیز صاحب نے کہا: "یعنی قلب کی حرکت بند ہونے کے بعد تپ دق وجہ موت ثابت ہوئی؟"

ہم نے کہا: "جی اور کیا بس یہ کہیے کہ حیلہ روزی بہانہ موت تھی۔"

عزیز صاحب نے کہا۔ "آپ اس قدر پریشان نہ ہوں، یہ تو دنیا کا دستور ہی ہے۔"

ہم نے کہا: "یہی تو اور رونے کی بات ہے کہ دنیا کا یہ دستور ہے۔ مجھ کو یہ لڑکی بے حد عزیز تھی۔ اس وقت اس کا دولھا بھائی کہہ کر لپٹ جانا یاد آ رہا ہے بہت چھوٹی سی تھی جب میری شادی ہوئی ہے۔"

عزیز صاحب نے کہا۔ "تو یہ آپ کی سالی بھی تھی۔ آپ نے تو کہا تھا کہ خالہ زاد بہن؟"

ہم کو بھی یاد آ گیا کہ پہلے خالہ زاد بہن کہا تھا۔ لہذا ہم نے فوراً کہا۔ "یعنی وہی خالہ زاد بہن دونوں رشتے تھے۔ مجھ سے دادھیال کی طرف سے خالہ زاد بہن

سکفی اور ننھیال کی طرف سے سالی ـــــــ افسوس؟

عزیز صاحب بیچارے دیر تک صبر کی تلقین فرماتے رہے۔ اور اس کے بعد بیچارے ہمارے اس حادثہ سے خود بھی رنجیدہ واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم فوراً ہاتھ منہ دھو کر زنانہ مکان میں چلے گئے، جہاں نیاز صاحب کے آنے کی اطلاع ملی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ دیر تک پکارتے رہے۔ مگر ہم نے سب سے کہہ دیا کہ آج جو کوئی بھی آئے اس کو واپس کر دو۔ ہم کسی سے نہ ملیں گے۔ طبیعت کچھ سست ہے اور یہ لوگ خواہ مخواہ پریشان کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر ہم اس محفوظ قلعہ میں نہایت اطمینان کے ساتھ بیوی سے باتیں کرتے اور بچوں سے کھیلتے رہے۔ اور باہر نکلے ہی نہیں مگر اتفاق کی بات کہ آج اور کوئی آیا بھی نہیں۔ البتہ جب دوسرے دن ہم دفتر جانے کے لئے باہر نکلے تو دروازہ سے نکلتے ہی نیاز کے ملازم سے کچھ اس طرح مڈبھیڑ ہو گئی کہ بھاگنا یا اپنے کو چھپانا امکان سے باہر ہو گیا۔ اس نے فوراً نیاز کا خط ہمارے ہاتھ میں دے دیا جس میں لکھا تھا۔

شوکت صاحب۔ دو مرتبہ میرا ملازم گیا۔ اور تیسری مرتبہ میں خود حاضر ہوا۔ مگر آپ کا پتہ نہ چلا۔ براہ کرم اس وقت روپیہ بھیج دو۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ کسی کا بار رہے۔ نہ مجھ پر نہ تم پر۔

نیاز

نیاز کا خط پڑھتے ہی بالکل الہامی طریقے پر ایک تجویز ہمارے ذہن میں آئی۔ چنانچہ ہم نے فوراً اپنی نشست گاہ میں جا کر ایک بہت پرانی چیک بک نکالی یہ اس وقت کی چیک بک ہے۔ جب آتش جوان تھا۔ مگر اب بینک میں اسی وقت

کے پٹے ہوئے تین روپے ہیں۔ بہرحال ہم نے چک بک نکال کر مبلغ سینتیس ۳۷ روپے آٹھ آنے کا چک لکھ کر اس خط کے ہمراہ نیاز کو بھیج دیا کہ:-

نیاز۔ کل رقم کا چک ارسال ہے۔ روپیہ اس وقت موجود نہیں یہ چک آٹھ دن کار آمد ثابت ہوگا۔

تمہارا شوکت

چک بھیج دینے کے بعد کم از کم آٹھ دن کے لئے نیاز صاحب سے اور خالہ زاد بہن عزت سالی کے چالیسویں تک کم سے کم عزیز صاحب سے نجات مل گئی ہے۔ عاقبت کی خبر اب خدا کو معلوم ہے۔ کہ کیا ہوگا۔ بہرحال اب یہ صورت ذہن میں ہے کہ اب کی مرتبہ چک تو بھیجیں گے عزیز صاحب کو قبرستان سے واپس آنے کا عذر کریں گے نیاز سے۔ اس وقت خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ کوئی نہ کوئی بہانہ اور ذہن میں آ ہی جائے گا۔ اور اس دوران میں ہم تمام ان رسائل اور اخبارات سے تقاضے کرتے رہیں گے جن پر اجرت باقی ہے۔ تاکہ کہیں سے کچھ مل جائے اور ہم اس بار سے سبکدوش ہو جائیں مگر احتیاطاً ہم یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم مقروض تو ضرور ہیں، لیکن "لے مار" یعنی نادہند قطعاً نہیں ہیں۔ اور ہمارا قطعی یہ ارادہ ہے۔ کہ یہ روپیہ ادا ضرور کریں گے۔ اپنی اسی زندگی میں۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ قرض بڑی بری چیز ہے۔ اس پر بھی تو غور کیجئے۔

مینار میں گنبد

قطب مینار کی آخری منزل تک پہنچنے کی سیڑھیاں بس ایسی تنگ ہو کر رہ گئی ہیں کہ ہمارا ایسا سینک سلائی آدمی تو نکل سکتا ہے۔ لیکن اگر مولانا شوکت علی چاہیں کہ وہ بھی ان سیڑھیوں سے اطمینان کے ساتھ گذر کر اوپر پہنچ جائیں تو ان کو اپنے جسم اور اس محدود گنجائش کے تناسب کو پیش نظر رکھ کر اقلیدس کی قابلیت صرف کرنا پڑے گی۔ اور اپنے جسم کو آڑا ترچھا کر کے ایسے زاویئے اختیار کرنا پڑیں گے کہ ایک طرف شانہ رگڑ رہا ہے تو دوسری طرف توند معرض خطر میں ہے بہرحال بمشکل تمام اور بعد از خرابیٔ بسیار شاید وہ اوپر تک پہنچ سکیں لیکن اگر ایک شخص اوپر سے آ رہا ہو اور دوسرا الضربہ والطویل نیچے سے اوپر جا رہا ہو تو سوائے تصادم کے اور کوئی صورت ہی ممکن نہیں ہو سکتی۔ اور تصادم بھی اس وقت تک بے نتیجہ ثابت ہوگا جب تک کہ اوپر سے آنے والا پھر الٹے پیر اوپر ہی کی طرف واپس نہ جائے۔ اور جب نیچے سے اوپر جانے والا اوپر پہنچ لے تو پھر وہ بیچارہ لائن کلیر لے کر نیچے اترے۔

اب کی مرتبہ دہلی کے سفر اور قطب مینار کی چڑھائی کے موقع پر کچھ ایسا ہی اتفاق پیش آیا کہ اول تو خدا خدا کر کے پسینہ میں ڈوبے ہوئے اور ہانپتے کانپتے ہم اس جگہ تک پہنچے جہاں سو بقول شخصے دو چار ہاتھ لب بام رہ جاتا ہے دوسرے

اس مینار کے وہ چٹخے ہوئے مقامات دیکھ کر بھی حواس گم تھے جن کو مضبوط لوہے کی پٹیوں سے باندھ دیا گیا ہے۔ پھر بار بار زلزلہ کا خیال آ رہا تھا۔ کہ اگر خدانخواستہ اس وقت زلزلہ آ جائے تو کیا ہوگا۔ ان سب پر طرہ یہ کہ عین ان تنگ سیڑھیوں پر دیکھتے کیا ہیں کہ ایک پہاڑ۔ جی ہاں گوشت اور ہڈیوں کا ایک پہاڑ لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا ہے۔ سیڑھیوں کی پوری چوڑان میں پھنسا ہوا یہ ہیولہ اس جان ناتواں کے سامنے آ کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ ایک سیڑھی درمیان میں خالی اور اوپر وہ اور نیچے ہم۔ ایک دوسرے کے سامنے رائی اور پربت کی مناسبت کی زندہ تصویر بنے کھڑے ہیں ہمارے پیچھے نیچے سے اوپر آنے والوں کی ایک فوج ظفر موج اور ان کے پیچھے اوپر سے نیچے جانے والوں کا لشکر جرار۔ ان کو ہٹا کر اوپر نکل جانا ہمارے کیا غالباً ہوا کے امکان میں بھی نہ تھا۔ اس لئے کہ قطب مینار کی وہ بالائی چوڑان ان کے جسم کا نہایت چست لباس بنی ہوئی تھی۔ اور وہ اگر نیچے بڑھیں تو بغیر ہم کو چٹنی کئے ان کا آگے بڑھنا ممکن ہی نہ تھا۔ ہم نے گھبرا کر ان کا منہ دیکھا۔ وہ کسی سکھ خاندان کی نازک اندام خاتون تھیں اور غالباً ان کے شوہر نامدار ان کی پشت پر تھے۔ جو اپنی اہلیہ محترمہ کے شانہ پر ہاتھ رکھ رکھ کر اپنے کو اچکا رہے تھے۔ کہ دیکھیں آگے قصہ کیا ہے۔ کہ وہ ایک دم سے ٹھہر گئی ہیں۔ ادھر نسیم صاحب نے جو ہمارے پیچھے تھے ہم کو آگے بڑھنے کے لئے دھکیلنا شروع کیا۔ "چلو بھائی سخت حبس ہے۔ ٹھیرو نہیں" ہم نے کہا "کیسے چلیں آگے نہیں دیکھو مینار میں گنبد والا قصہ ہے"

نسیم صاحب نے ہماری بغل سے منہ نکال کر اس منظر کو دیکھا اور بجائے

اس کے کہ اس مشکل کا کوئی حل بتاتے آپ کو ہماری ذہانت کا اعتراف زیادہ ضروری معلوم ہوا۔ ہماری پیٹھ پر شاباشی کا ہاتھ ٹھونک کر قہقہہ لگاتے ہوئے بولے "بھئی واللہ کیا کہی ہے۔ مینار میں گنبد کی بھی ایک ہی رہی۔"

ہم کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ اس عظیم الشان محترم خاتون کی بغل سے اس کے شوہر نے منہ نکال کر کہا۔ "آپ نے اوپر جانا ہے؟" ہم نے کہا: "آپ خود ہی غور فرمایئے ع
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی "

سردار جی نے سردارنی صاحبہ کی بغل سے فرمایا: "تو پھر اب کیا ہو؟"

ہم نے کہا۔ "جو رائے عالی ہو۔ دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ آپ لوگ ذرا اوپر کی طرف مڑ جائیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ ہم لوگ پھر نیچے چلے جائیں اور جب آپ نیچے اتر لیں تو ہم از سر نو پھر اوپر آئیں۔"

سردار جی تھے ذرا معقول قسم کے آدمی۔ کہنے لگے۔ نہیں جی آپ ذرا توکف (توقف) کریں۔ ہم اوپر جاتے ہیں۔"

یہ کہہ کر سردار جی نے اوپر جانے کے لئے اپنے پیچھے آنے والے تمام حضرات کا رُخ اوپر جانے کے لئے بدل دیا۔ البتہ محترمہ سردارنی صاحبہ مدظلہا کے لئے یہ ایثار کوئی معمولی بات نہ تھی۔ پہلے تو اس غریب خاتون نے داہنے سے بائیں کی طرف اپنے کو موڑنا چاہا۔ مگر جسم کچھ اس طرح پھنسا تھا کہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ پھر بہت زور لگا کر بائیں سے داہنے کی طرف گھومنے کی ناکام کوشش کی۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ بیچاری نہایت ایمانداری کے ساتھ گھومنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور کچھ تو اس کوشش کی وجہ سے اور کچھ حبس کی وجہ سے اور غالباً زیادہ تر اپنے مٹاپے کی خجالت

کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہوئی جاتی تھی اور بار بار ہم کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھتی تھی کہ گویا اپنا مٹاپا ہم کو دے کر ہماری دھان پان جسامت ہم سے طلب کر رہی ہے نسیم صاحب ہماری بغل سے منہ نکالے ہوئے سردارنی صاحبہ کی اس کوشش پر مسلسل ہنس رہے تھے۔ اور ان کو ایسے نازک موقع پر تفریح ہو رہی تھی۔ مگر ہم کو اس خاتون کے ساتھ اس لئے ہمدردی پیدا ہوگئی تھی کہ اب سوائے اس کے اور کوئی صورت ہی نہ تھی کہ یا تو ان محترمہ کے ٹکڑے کئے جائیں اور ان ٹکڑوں کو یہاں سے نکالا جائے یا ہندوستان کی اس تاریخی یادگار کو اسی وقت توڑا جائے اور اس طرح قطب مینار میں سے اس گنبد کو برآمد کیا جائے۔ بہرحال ہم نے سردارنی صاحبہ کو نہایت سنجیدگی اور ہمدردی کے ساتھ مشورہ دیا۔ "ذرا شلوار کو سمیٹئے۔ دوپٹے کو سنبھالئے۔ اور سانس روک کر جسم کے پھیلاؤ کو سکیڑنے کی کوشش کر کے جلدی سے مڑ جائیے۔" نسیم پھر کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ اور سردارنی بیچاری پھر کچھ جھینپ کر رہ گئی۔ مگر غالباً اس نے ہمارے اس مشورہ پر عمل ضرور کیا۔ اس لئے کہ ہم نے دیکھا کہ وہ ایک مرتبہ نتھنے پھلا کر اور چہرہ کو سرخ کر کے کچھ اس طرح متحرک ہوئی کہ ایک ہچکولے کے ساتھ اس کا رخ بدل گیا۔ نسیم صاحب نے بے اختیاری کے عالم میں "ول ڈن" کہہ کر تالی بجانا شروع کی اور سردارنی صاحبہ غبارہ بنی ہوئی نیچے سے اوپر کی طرف بڑھیں۔ اور ان کی قیادت میں ہم سب آگے بڑھے۔ مینار کی آخری کھلی ہوئی منزل پر پہنچ کر ہم نے سب سے پہلے سردار صاحب کا شکریہ ادا کیا جن کی عنایت سے ہم یہاں تک پہنچنے کے قابل ہوئے تھے۔ اس کے بعد ہم نے ان کو مشورہ دیا کہ اب کی آپ آگے چلیں۔ اور محترمہ سردارنی صاحبہ کو پیچھے رکھیں تاکہ آپ راستہ

صاف کراتے رہیں۔ ایک اور صاحب نے کہا تیسری منزل تک آکر چوتھی پر نہ آنا بھی تو حماقت ہے۔ ان تمام باتوں پر سردار صاحب کچھ اس طرح مسکرا رہے تھے کہ گویا ایک عظیم الشان بیوی کے شوہر ہونے پر فخر کر رہے ہیں۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ایسے پہاڑ سے سر ٹکرا کر اب تک سلامت رہنا ان ہی کا کام تھا۔ ان کو تو چاہیئے تھا کہ ننگا پربت کی مہم میں جرمن قافلہ کی قیادت فرماتے۔ بہرحال اس وقت قطب مینار کے اوپر پہنچ کر کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اوپر سے دہلی کے مناظر کو دیکھ رہا ہو بلکہ سب ہی سردارنی صاحبہ کو دیکھنے میں محو تھے۔ اور خود سردارنی صاحبہ اس جدوجہد کے بعد کچھ اس طرح ہانپ رہی تھیں کہ گویا ابھی رستم ہند کو پچھاڑ کر اکھاڑے سے نکلی ہیں۔ سردار صاحب نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ہم کو اور دانت نکال نکال کر سب کو سلام کیا۔ اور نیچے اترنے کے لئے آگے چلے۔ اور پیچھے ان کی "افوہ" تھیں۔ ان میاں بیوی کے جانے کے بعد ہم سب نے قطب مینار پر سے دہلی سے لے کر غازی آباد تک کی سیر کی خوب ہوا کھائی۔ دوربین لگا لگا کر دور دراز مناظر کو دیکھتے رہے۔ اور جب اچھی طرح وقت کی میزان پر اندازہ کر لیا کہ اب سردارنی صاحبہ نیچے پہنچ گئی ہوں گی تو ہم لوگ بھی چلے اوپر سے نیچے۔ تیسری منزل سے کوئی دس سیڑھیاں اوپر تک تو بخیریت تمام ہم اور ہمارے سب ساتھی نیچے اتر آئے۔ مگر اب جو دیکھتے ہیں تو سردارنی صاحبہ موجود ہیں۔ ہم نے بے ساختہ کہا "ارے"۔ نسیم نے ہمارے شانہ کے اوپر سے گردن نکال کر کہا۔ "دیکھا آپ نے۔ میں کہتا تھا ابھی نہ چلیئے۔ راستہ بند ہوگا" مگر سردارنی صاحبہ پھنسی ہوئی نہ تھیں۔ بلکہ نیچے جا رہی تھیں۔ ہم نے گویا مڑ آئی

صاحبہ سے اپنی آواز پھنداکر سردار صاحب سے کہا۔ "ابھی تک آپ لوگ یہیں ہیں!"

سردار صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "ہاں جی۔ وہ تو پھر پھنس گئے تھے نا۔ ایک صاحب نے اوپر جانا تھا۔ اب وہ آگئے ہیں اور نیچے جا رہے ہیں۔ ہم نے کہا "خیر ان بیچاروں نے اپنی رجعت قہقری سے ہم سب کی مشکل آسان کر دی۔" سردار صاحب بغیر کچھ سمجھے ہوئے ہی ہی ہی کر کے ہنس دیئے، اور اسی طرح باتیں کرتے ہوئے ہم لوگ تیسری منزل تک پہنچ گئے، جہاں سے سیڑھیاں چوڑی ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ اور باوجود سردارنی صاحبہ کی جسامت کے راستہ بند ہونے کا امکان ختم ہوگیا یعنی سردارنی صاحبہ اگر ایک طرف ہو جائیں تو ہمارے ایسے المختصر لوگ نہایت آسانی کے ساتھ نکل سکتے تھے۔ چنانچہ ہم نے یہی کیا کہ تیسری منزل کے آتے ہی سردارنی صاحبہ نے جو گنجائش مرحمت فرمائی تھی اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ اور جان بچا کر بھاگے نیچے کی طرف۔ اب یہ طرفہ تماشہ ملاحظہ فرمایئے کہ دوسری منزل قریب ہی تھی کہ دیکھتے کیا ہیں ایک مارواڑی لالہ سچ مچ کا گنبد نما توند لئے اوپر تشریف لا رہے ہیں۔ یہ لالہ کسی طرح سردارنی سے کم نہ تھے۔ بلکہ اگر دونوں کا موازنہ کیا جائے تو سردارنی انیس اور یہ بیس ہی نکلیں گے ان لالہ کو دیکھ کر بے ساختہ ہنسی آگئی نسیم نے چھوٹتے ہی کہا۔ ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا نبٹنا۔ اور یہ پڑ گئی کیسی مرے اللہ نئی۔

ہم نے کہا۔ "اطمینان رکھو یہاں سیڑھیاں چوڑی ہیں!"

نسیم نے کہا "نہیں یہ مطلب نہیں ہے بلکہ دیکھنا تو یہ ہے کہ جب

ان دونوں کا مقابلہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ یقیناً یہ نہ اوپر جا سکیں گے، نہ وہ نیچے آسکیں گی۔"

ہم نے لاٹ کی بغل سے نیچے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ہاں ہوگا تو لطیفہ ضرور۔"

نسیم نے کہا۔ "لطیفہ یا اچھا خاصا تماشہ۔ دیکھنا چاہیئے اس تماشہ کو۔"
ہم نے کہا۔ "نا بابا۔ بخشو مجھ کو پسینہ میں ڈوبا ہوا ہوں اور گرمی کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔ دوسرے یہ بھی تو غور کرو کہ ایسے ایسے پہاڑوں کی ٹکر سے خود قطب مینار کس قدر خطرہ میں ہے۔"

بہرحال ہم لوگ اپنی اپنی جان بچا کر کسی نہ کسی طرح نیچے پہنچ گئے۔ اور گھاس پر بے دم ہو کر پڑ رہے۔ کھلی ہوا کھائی۔ شاداب گھاس پر لوٹے اور جھرنے کا نگین ٹھنڈا پانی پیا۔ جس کو دلی والے آب حیات کہتے ہیں۔ تو جان میں جان آئی
نسیم نے کہا۔ "پنڈلیاں بھر گئی ہیں۔" ہم نے کہا "معلوم ہوتا ہے پیادہ بیس میل دوڑ کر آئے ہیں۔ خستگی تو دیکھئے کتنی ہے۔" نسیم نے کہا۔ "شاباش ہے سردار جی کو۔"
ہم نے کہا: "واقعی ایسے لوگوں کو اوپر چڑھانے کے لئے وہ مشین استعمال ہونا چاہیئے جو جہازوں پر مال چڑھانے اور اتارنے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔" نسیم نے کہا۔ "اس وقت تو دل چاہتا ہے کہ کوئی پیر دبائے۔ اور ہم سو جائیں اسی گھاس پر پڑ کر۔" ہم نے کہا۔ "اچھا اٹھئے ابھی اوکھلے بھی چلنا ہے۔" نسیم نے کہا۔ "واہ ذرا سردار جی کو تو آ جانے دیجئے۔" ہم نے کہا۔ "وہ کیوں؟" کہنے لگے۔ "پوچھیں گے کہ لاٹ کے تصادم سے کیا واقعہ ہوا۔ اور کیونکر اس حادثہ سے قطب مینار کو محفوظ رکھا گیا۔" ہم لوگ دیر تک اسی طرح

باتیں کرتے رہے تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد سردار صاحب اور ان کے پیچھے ان کی "نحیف الجثہ" بیوی برآمد ہوئیں۔ ہم دونوں ان کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے، اور سردار جی نے ہم کو دیکھتے ہی اپنی ڈاڑھی کھجا کر دانت نکال دیے۔ البتہ ان کی "افوہ" نے بیٹھ موڑ لی۔ نسیم نے کہا "پھر تو آپ کہیں نہیں پھنسے تھے؟"

سردار صاحب نے کہا "ہاں جی۔ وہ ایک موٹا آدمی پیچھے اوپر جا رہا تھا۔ اس کی وجہ سے ذرا دکت (دقت) ہوئی تھی۔"

ہم نے کہا "پھر آپ نے کیا کیا۔ ہم دونوں کو یہی فکر تھی کہ آپ نے کیا کیا ہوگا؟"

سردار جی نے کہا "ہاں جی میں نے اس کو بولا اگر تم نے اوپر جانا ہے تو تم پہلے نیچے چلو اور نیچے کی منزل کے دروازہ میں کھڑے ہو جاؤ۔ اس نے ایسا ہی کیا۔"

نسیم نے ہنس کر کہا "لاحول ولا قوۃ عجیب مصیبت تھی یہ بھی۔ اب تو آپ نے بھی توبہ کر لی ہوگی کہ کبھی اوپر نہ جائیں گے۔ سردار جی نے کہا "نا جی میں تو پہلے بھی جا چکا ہوں۔ اس کو دکھانا تھا نا۔ (ہنس کر) اور اب یہ بھی کان پکڑے گی۔" یہ پوچھے بغیر کہ آپ کے یا اپنے۔ نسیم نے کہا "بیچاری کو بڑی تکلیف ہوئی۔ مگر اس میں ان کا قصور نہیں۔ قصور قطب مینار ہی کا ہے۔ کہ وہ اوپر جا کر اس قدر پتلا ہو گیا ہے۔"

ہم نے کہا "اور کچھ سردارنی صاحبہ کا بھی جسم اچھا ہے۔"

سردار صاحب نے کھیسیں نکال کر سفید سفید دانت چمکائے، اور کہا ہاں

جی۔ یہ خود ڈبل ہے ذرا۔"

ہم نے کہا آپ ان کو ورزش کرایا کیجیے۔ محنت سے بدن گھٹے گا۔"

سردار نے ہم کو بڑی زور سے گھور کر دیکھا۔ غالباً اس کو ہمارا یہ ہونسنا برا معلوم ہو رہا تھا۔ سردار صاحب خاموش رہے۔ اور ہم برابر سردار صاحب کو مشورہ دیتے رہے۔ "غذا کم ہو اور محنت زیادہ تو جسم گھٹنے لگتا ہے۔ صبح دوڑ لیا کیجیے، اور اگر چکی پسوائیے تو بہت مفید ثابت ہوگی۔"

سردار جی نے ہم کو پھر اس طرح گھورا کہ گویا ہم مسجد شہید گنج ہیں۔ اور سردار جی نے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا اور ادھر مڑ گئے، نسیم نے قہقہہ لگا کر کہا "بھئی واللہ میاں رئیس گنبد کی تم نے بہت کہی تھی۔"

لکھنؤ کانگریس سشن

لکھنؤ میں اس مرتبہ انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اور خوب ہوا۔ خاصی چہل پہل تھی۔ خاصی رونق تھی۔ آریہ نگر کے جنگل میں ایسا منگل منایا گیا کہ اس ویرانہ کو موتی نگر بنا کر چمکا دیا گیا۔ نمائش بھی تھی اور مشاعرہ بھی۔ ڈرامہ بھی ہوا اور کوئی سمیلن بھی۔ لیکن اگر سچ پوچھیے تو اس موقع پر ہم کو رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ ارباب کانگریس اس گلستان اودھ کی طرف اس وقت متوجہ ہوئے جب اس چمن کی بہاریں لوٹ لی گئیں اور خزاں نے اس کو اجڑا ہوا دیار بنا دیا۔ کاش وہ شاہی زمانہ ہوتا۔ جب یہاں کا ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات ہوا کرتی تھی۔ اس عروس البلاد میں اگر اس وقت کانگریس سشن ہوتا تو معلوم بھی ہوتا کہ ہاں صاحب لکھنؤ میں بھی کانگریس ہوئی تھی۔ مگر اب تو جس طرح احمد آباد یا بمبئی میں اجلاس ہو گئے اسی طرح لکھنؤ میں بھی اس فرض سیاسی کو ادا کر دیا گیا۔ اگر اس وقت یعنی جب لکھنؤ لکھنؤ تھا یہاں سشن ہوتا تو اخبارات وہ رپورٹ پیش نہ کرتے جو آج پیش کی جا رہی ہے۔ بلکہ اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے عالم تصور کی سیر کرنا چاہیں تو اپنے کو لکھنؤ کے شاہی دور میں فرض کر لیجیے۔ اور ملاحظہ فرمائیے اس شاہی دور کے کانگریس سشن کی روداد۔

لکھنؤ کے موتی نگر کا صدر دروازہ جامہ وار کا بنا ہوا تھا۔ اور اوپر ایک

گنگا جمنی چھپر لگا تھا۔ اس چھپر کے نیچے ہی روشن چوکی رکھی گئی تھی جس کے سریلے زمزمے فضا میں ایک وجد کی سی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ اس دروازہ پر مجلس استقبالیہ کے صدر اور چند اراکین مہمانوں کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ اور نہایت گرمجوشی کے ساتھ بڑھ بڑھ کر اور دیدۂ و دل فرش راہ کر کر کے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب بہار نظر آتی تھی۔ سرخی کٹی ہوئی۔ سڑکوں پر کیوڑہ اور گلاب کا چھڑکاؤ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہو رہا تھا اور سڑکوں کے در و دیوار ریشمی جھنڈیوں کے ساتھ ساتھ چنبیلی اور بیلے کے پھولوں کی لڑیاں عطر میں بسی ہوئی حسن افروز بھی بنی ہوئی تھیں اور شامہ نواز بھی۔ ان ہی سڑکوں پر جا بجا سائی حقہ لئے ہوئے اور حقہ پر ہار لپیٹے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ جن کے خمیرے کی خوشبو اور بھی قیامت تھی۔ جو سڑک صدر دروازہ سے عام اجلاس کے پنڈال تک گئی تھی اس کے دونوں طرف دوکانیں لگی ہوئی تھیں کوئی پان کی دوکان تھی تو کوئی پھلکیوں کی۔ کہیں گنڈیریاں برف میں دبی ہوئی پھولوں میں بسائی جا رہی تھیں۔ تو کہیں دوکان پر انواع و اقسام کے کنکوے اور ہر قسم کی ڈور سجی ہوئی تھی۔ کوئی جامدانی کی دوکان تھی۔ تو کسی دکان میں لکھنؤ کی مشہور و معروف زردوزی کے نمونے نظر آتے تھے۔ مختصر یہ کہ دو فرلانگ تک یہ خاص سڑک اسی طرح بارونق بنائی گئی تھی۔ کہ گویا چوک کی تمام چہل پہل اس سڑک نے حاصل کر لی ہے۔ وہی چہچہے تھے اور وہی غلغلے۔

دو فرلانگ تک اس خوبصورت اور بارونق معطر اور منور سڑک پر چلنے کے بعد کانگریس کے عام اجلاس کا وہ پنڈال ملتا تھا۔ جس کو لکھنؤ کی نفاست پسند دل کا

ایک جامع نمونہ کہنا چاہیئے، پنڈال جالی کا بنایا گیا تھا۔ تاکہ ہوادار بھی رہے اور خوشنما بھی۔ پنڈال کے تمام ستون چاندی کے تھے۔ اور شرکاء اجلاس کو شبنم سے بچانے کے لئے پنڈال کے اوپر ایک مخملی شامیانہ لگایا گیا تھا جس میں ہر طرف خس کے پردے اس صنعت کے ساتھ لٹکائے گئے تھے کہ اگر رات کا اجلاس ہو تو ان پردوں کو باندھ دیا جائے۔ اور جالی سے چھن چھن کر تازہ ہوا آسکے۔ اور اگر دن کا اجلاس ہو تو لو سے حاضرین کو بچانے اور پنڈال کو خنک رکھنے کے لئے یہ پردے کھول دیئے جائیں۔ پنڈال میں ہر طرف رومی قالین اور مخملی گاؤ تکیے نظر آتے تھے۔ صرف صدر منتخب کے لئے اس پنڈال کے اندر زرکار چوبی شامیانہ لگایا گیا تھا۔ جس کے نیچے زرتار مسند اور تکیہ تھا۔ اور سامنے ہی قدآدم ایک سونے کا پیچوان اور سونے کے خاصدان کے قریب گنگا جمنی کا اگال دان رکھا ہوا تھا۔ صدر کے علاوہ تمام حاضرین اور شرکاء اجلاس کے لئے چاروں طرف چاندی کے خاصدان اور پیچوان رکھے گئے تھے اور تھوڑی تھوڑی دور پر اگال دان نہایت سلیقہ اور قرینہ سے سجائے گئے تھے۔ وسط میں گلدانوں کی قطار اس طرح تھی کہ ہر گلدان کے بعد اگر کی بتیاں اور دیگر اقسام کی خوشبو جلانے کے لئے چنگیر رکھے ہوئے تھے۔ اور ہر چنگیر کے بعد ایک گلدان تھا۔ تھوڑی تھوڑی دور پر موم بتیوں کے لالے روشن تھے۔ اور پنڈال کو موم بتیوں کے ہزاروں جھاڑوں اور قندیلوں سے منور کر دیا گیا تھا۔

اجلاس کا وقت ۸ بجے شب مقرر ہوا تھا۔ مگر 9 بجے سے شرکاء نے آنا شروع کیا اور دس بجے کے قریب تمام پنڈال معزز حاضرین سے بھر گیا۔ اور ٹھیک سوا دس بجے پہلے تو گولا چھوٹا۔ پھر روشن چوکی نے ایک ترانہ گایا۔ اور آخر میں نقیب

نے بھرے پنڈال میں آکر آواز لگائی ؎

نگہ دار، ہوشیار آتے ہیں
صدرِ عالی وقار آتے ہیں

یہ سنتے ہی تمام حاضرینِ بزم کھڑے ہو گئے، اور پنڈال کے صدر دروازہ سے زرق برق لباس پہنے ہوئے پہلے تو چوبدار داخل ہوئے۔ اور درمیان میں صدرِ محترم تاروں کے جھرمٹ میں چاند کی طرح خراماں تشریف لائے، ہر طرف سے لوگوں نے جھک جھک کر سلام کئے۔ اور خود صدرِ محترم نے سب کے سلاموں کا جواب جھک جھک کر، آداب بجا لاکر، اور تسلیمات عرض کرکے، ہاتھ جوڑ جوڑ کر اور مسکرا مسکرا کر دیا۔ اس کے بعد صدرِ محترم اپنی جگہ پر رونق افروز ہوئے۔ اور آپ کے تشریف فرما ہوتے ہی تمام حاضرینِ بزم قرینے سے اپنی اپنی جگہ پر دو زانو بیٹھ گئے، اس کے بعد اجلاس کی باضابطہ کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی مجرا شروع کر دیا گیا۔ کچھ دیر تک لکھنؤ کی مشہور مغنیہ حسّو جان نے موسیقی کے کمالات دکھا کر حاضرینِ محفل کو مسحور کیا۔ اس کے بعد بنارس اور آگرہ کی دو چوکیاں بیٹھیں۔ آخر میں میاں مصطفیٰ حسین کا مردانہ طائفہ آیا جس نے دور دور سے آئے ہوئے مندوبینِ کانگریس کو لکھنؤ کے بھانڈوں کا گرویدہ بنا دیا۔ اس نغمہ و رقص کا سلسلہ دو گھنٹے تک جاری رہا۔ اور اس کے بعد کانگریس کے اجلاس کی باقاعدہ کارروائی اس طرح شروع کی گئی کہ صدر مجلس استقبالیہ نے حاضرینِ بزم میں سے ایک ایک سے اجازت طلب کرنے کے بعد اور آخر میں صدرِ محترم سے ہاتھ جوڑ کر اجازت طلب کرکے اپنا خطبہ اس شعر سے شروع کیا۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اس شعر کے پڑھتے ہی تمام پنڈال سبحان اللہ۔ ماشاء اللہ اور "کیا برمحل صرف ہے اس شعر کا" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اور صدر مجلس استقبالیہ نے اپنا خطبہ ملتوی کر کے ہر طرف گھوم گھوم کر سلام شروع کر دیئے، اور "مکرر ارشاد" کے حکم کی تعمیل میں اس شعر کو پھر پڑھا۔ اور شعر کے بعد اپنا خطبہ جو مقفیٰ اردو میں تحریر کیا تھا شروع کیا۔ اس خطبہ کے ایک ایک حصہ پر حاضرین کی طرف سے داد دی جا رہی تھی اور صدر مجلس استقبالیہ کا ہاتھ گویا سلام کرنے کی کمانی دار مشین بنا ہوا تھا۔ یہ خطبہ گو بہت مختصر تھا۔ مگر مکرر ارشاد کے تقاضوں، اور خطیب کے سلام کرنے اور داد وصول کرنے کے وقفوں کی وجہ سے ایک گھنٹہ میں ختم ہوا۔ اور خطبہ کے ختم ہونے کے بعد بھی تحسین و آفرین کا سلسلہ پندرہ بیس منٹ تک جاری رہا۔ اس کے بعد صدر محترم کھڑے ہوئے اور آپ کے کھڑے ہوتے ہی ہمہ حاضرین بزم نے بھی کھڑے ہو کر تعظیم دی۔ مگر صدر محترم کے اشارے سے سب پھر بیٹھ گئے۔ اب صدر محترم نے حاضرین سے ہاتھ جوڑ کر اپنا خطبہ شروع کرنے کی اجازت طلب کی، جس کا جواب سب نے ہاتھ جوڑ کر "بسم اللہ" اور "سب ہمہ تن گوش ہیں" کے متفقہ نعروں سے دیا۔ آخر تین چار مرتبہ کھنکھار کر اور ریشمی رومال سے منہ صاف کرنے کے بعد صدر محترم نے فرمایا ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید

اور اے حضور

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اس شعر کا پڑھنا تھا کہ "سبحان اللہ" کا وہ فلک شگاف نعرہ بلند ہوا ہے کہ خود صدر محترم بھی تھوڑے اچھل پڑے۔ اور پھر فوراً سنبھل کر آپ نے سلام کرنے شروع کر دیئے۔ تین چار مرتبہ حاضرینِ محفل کے اصرار سے اسی شعر کو پڑھنا پڑا۔ پھر بھی حاضرین نے یہی کہا کہ حضور سیری نہیں ہوئی۔ ایک مرتبہ اور مرحمت فرما دیجئے۔ آخر صدر محترم نے پھر یہی شعر پڑھا۔ اور شعر پڑھنے کے بعد اپنا خطبہ شروع کیا۔

"ہر چند کہ یہ خاکسار فرائض صدارت سے ناچار تھا۔ خود بھی علیل تھا اور ٹیپر بھی اس ہیچدان کا بیمار تھا۔ مگر آپ حضرات کا اصرار، اور پھر اس اصرار کی تکرار، مجبوراً مزید انکار سے قاصر ہوا۔ اور افتاں و خیزاں تعمیل حکم کے لئے حاضر ہوا۔

حاضرین نے "کیا سلاست ہے اور کیا روانی ہے" کا نعرہ بلند کیا اور صدرِ محترم نے جھک جھک کر کلام کا تمام لوچ سلاموں میں صرف کرنے کے بعد پھر فرمایا۔

"آپ کے سرِ عزیز کی قسم کھاتا ہوں۔ بلکہ باوا جان مرحوم کی روحِ پاک کو درمیان میں لاتا ہوں کہ میں ہرگز اس اعزاز کے قابل نہ تھا، اور انکار میرا کسرِ نفسی میں شامل نہ تھا۔ مگر آپ حضرات نے اس کو عذرِ لنگ جانا۔ اور میرا کوئی حیلہ صحیح نہ مانا۔ مختصر یہ کہ اپنی تمام مجبوریوں کو بھول جانا پڑا۔ اور کشاں کشاں جانبِ بزمِ کانگریس آنا پڑا۔"

حاضرین نے پھر "حضور واللہ ہے کہ موتی پرو دیئے ہیں۔ اور جواہرات جڑے ہیں" کی صدائیں بلند کیں اور صدرِ محترم نے ہاتھوں کو جوڑ کر "آپ عزت بڑھاتے ہیں" کہہ کر فرمایا۔

آج ہمارے پیش نظر جو سوال ہے، وہ کوشش کے بعد آسان اور بغیر کوشش

کے سخت محال ہے"

حاضرین نے ہم آواز ہوکر کہا:-

"کیا کلیہ بیان فرمایا ہے حضور نے"

صدر محترم نے پھر مجرا بجالاکر ارشاد فرمایا:-

"باہمی اتفاق یعنی سد باب نفاق و شقاق، ازبس ضروری ہے، اور بغیر اس کے منزل مقصود تک پہنچنے میں سخت مجبوری ہے۔ ہماری راہ پُرخطر اور دشوار ہے، منزل دور ہے اور راستہ ناہموار ہے۔ مگر کچھ بھی ہو اب تو ملنا ہے یا مٹانا ہے یعنی بہر صورت مقدر کو آزمانا ہے۔ اگر ہمارے ارادوں میں استقلال ہے تو سمجھ لیجئے کہ درخشاں نیر اقبال ہے"

"آمین آمین۔ آپ کے منہ میں گھی شکر" کے نعروں سے پنڈال گونج اٹھا

صدر نے پھر فرمایا۔

ہم کو آج یہ طے کرنا ہے کہ اب ہم کو زندہ رہنا ہے یا مرنا ہے۔ ذلتوں کی انتہا ہوگئی۔ تکلیف حد سے سوا ہوگئی۔ ہم شاہزادے ہوکر بات بات کا محصول اور لگان ادا کریں۔ ہم سے محصول و لگان مانگنے والے خدا خدا کریں۔ کہا جاتا ہے کہ ہم پیٹ کاٹ کر اور بٹیروں کی پالیاں بند کرکے مالیہ کی ادائیگی کا انتظام کریں۔ گویا ہم اپنی جان سے دور، جان دے دیں۔ اور بٹیریں بھی نصیب اعداء مریں"

حاضرین نے۔ "دور پار۔ چھائیں پھوئیں مدعی" کا نعرہ بلند کیا۔ اور صدر محترم نے پھر اپنا خطبہ شروع کیا۔ اس خطبہ میں شروع سے آخر تک اس قسم کی شکایتیں تھیں کہ جب حکومت ہماری ہے، اور ہم خود شاہزادے ہیں تو ہم مرغ کی پالیوں

ٹیکس۔ بٹیر بازی اور کنکوے بازی وغیرہ کے محاصل کیوں ادا کریں۔

یہ خطبۂ صدارت تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ میں ختم ہوا۔ اور آخر میں جناب صدر نعرہ ہائے تحسین و آفریں کے درمیان سلام کرتے ہوئے تھک کر خستہ ہو کر۔ پسینہ پسینہ ہو کر بیٹھ گئے، چوبداروں نے پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔ کوئی برف آب لے کر دوڑا۔ تو کسی نے خاصدان پیش کیا۔ آخر دس بارہ منٹ کے بعد صدر محترم کے حواس بجا ہوئے۔ اور اس کے بعد اجلاس کے ایجنڈے کے مطابق کارروائی شروع ہوئی۔

سب سے پہلے دربار شاہی میں نیابت کا مسئلہ تھا۔ شاہی خاندان کے دیگر نواب زادگان وقت کا مطالبہ یہ تھا کہ ان کو بھی دربار میں کرسی نشینی کے ۳۲ فیصدی حقوق دیے جائیں۔ چنانچہ نواب زادگان اودھ کی طرف سے جس وقت اس سوال کو لے کر نواب دلارے مرزا صاحب کھڑے ہوئے ہیں اور حاضرین محفل کو جھک جھک کر سلام کئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسی وقت سے ایک عجیب سماں بندھ گیا تھا۔ آپ نے سب سے پہلے تو اپنا بٹیر اپنے خدمتگار کو دیا۔ اس کے بعد ایک۔ مدلل مقفیٰ اور مسجّع تقریر میں دربار شاہی میں اپنے ۳۲ فی صدی حقوق پر زور دیا۔ اور آدھ گھنٹہ تک تقریر کرنے کے بعد خراج تحسین حاصل کرتے ہوئے بیٹھ گئے۔ آپ کی تقریر کا جواب دینے کے لئے شاہزادۂ والا تبار، برہان الدولہ نواب فلک رفعت بہادر کھڑے ہونے والے تھے۔ لہذا خدمتگار نے فوراً آئینہ پیش کر دیا۔ آپ نے آئینہ میں ٹوپی کو درست کرکے اور مونچھوں کا تاؤ ٹھیک کرنے کے بعد ایک گلوری نوش فرمائی۔ اور اس کے بعد

کھڑے ہوگئے، ہر طرف سے "یاعلی" اور بسم اللہ کا نعرہ بلند ہوا۔ جس کے جواب میں آپ نے حاضرین کو سلام کرنے کے بعد فرمایا:۔

"اے حضرت میں معافی کا خواستگار ہوں۔ اختلاج قلب کا پرانا بیمار ہوں آپ کو معلوم ہے بھائی دلارے مرزا عرف لاڈلے نواب میرے دوست ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو میرے گوشت اور پوست ہیں۔ مگر آج انھوں نے غیروں سے بڑھ کر مغائرت سے بھری ہوئی تقریر کی ہے۔ یعنی اپنے اور میرے دوستانہ مراسم کی تحقیر کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آخر حقوق میں فی صدی کا کیا سوال ہے دوستی میں تو سب کا یکساں حال ہے۔ وہ سر آنکھوں پر دربار میں تشریف لائیں اور اگر کوئی کرسی خالی نہ ہو تو ہمارے دل میں جگہ پائیں۔ مگر خدا کے لئے یہ یہ غیریت نہ فرمایئے، آیئے اور بسر و چشم دربار میں تشریف لایئے۔ نواب فلک رفعت سلام کرکے بیٹھ گئے۔ اور اس کے بعد نواب دلارے مرزا پھر کھڑے ہونے والے تھے مگر تسبیح دیکھ کر پہلے تو کچھ ٹھٹک گئے، اور آخر کھڑے ہوکر صرف اتنا کہہ دیا کہ میں کچھ عرض کرتا۔ مگر استخارہ منع آرہا ہے۔ گویا بھائی صاحب نواب فلک رفعت کی من جانب اللہ تائید ہو رہی ہے۔ لہٰذا یہاں بھی سر تسلیم خم ہے۔

ایجنڈے میں اب آزادی کامل کی تجویز تھی۔ امید تھی کہ اس پر زبردست مباحثہ ہوگا۔ مگر ہوا یہ کہ تجویز تو متفقہ طور پر منظور ہوگئی۔ مگر سوال یہ تھا کہ آخر اس تجویز کو عملی صورت میں کونسی جماعت لائے۔ نواب زادگان نے شاہزادوں کی طرف اشارہ کرکے کہا:۔

"حضرت پہلے آپ آزادی حاصل کریں۔

شاہزادوں نے کہا۔ "نہیں پہلے آپ"

نواب زادوں نے کہا۔ "پہلے آپ"

شاہزادوں تے۔ "واللہ یہ نہ ہوگا۔ پہلے آپ، آخر اسی پہلے آپ، اور نہیں حضت پہلے آپ، میں صبح ہوگئی۔ اور اجلاس ختم ہوگیا۔

اس طلسم خیال کو توڑیئے اور بتایئے کہ ایسی مہین کانگریس کے مقابلہ میں جس کا نازک بدن تصور جوف دماغ میں محدود و تخیل رہ گیا ہے، ہم کو باوجود تمام زیبائشوں اور رونقوں کے یہ کھدر قسم کی کانگریس کیونکر پسند آسکتی تھی یا کسی ایسے شخص کو اس قسم کا کانگریس سشن کیونکر پسند آسکتا ہے۔ جس کا دماغ عہد پارینہ کے تصور سے معطر ہو رہا ہو۔

اختلاج

خدا اپنے ہر بندے کو دولتِ اختلاج قلب سے مالا مال کردے۔ ع

این دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

بات یہ ہے کہ جناب یہ خاکسار کوئی خود غرض تو ہے نہیں کہ ایک نعمتِ عظمیٰ کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کر لے۔ اور اپنے علاوہ دنیا میں کسی اور کو اختلاج قلب کے مرض میں..... مبتلا ہی نہ ہونے دے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے تمام احباب و اعزہ کو، ہمارے تمام ہمدردوں اور غمگساروں کو اور ہر دوست اور دشمن کو اگر خدا کسی مرض میں مبتلا کرے تو وہ مرض اختلاج اور صرف اختلاج ہو۔ بلکہ اگر کسی شخص کی قسمت میں کوئی بھی مرض نہ لکھا گیا ہو صرف تندرستی ہی لکھی ہوئی ہو تو بھی اس کو خداوندعالم اپنے خزانۂ غیب سے اختلاج قلب عطا کردے۔ ہم اختلاج کے پرانے مریض ہیں اتنے پرانے کہ۔ ع

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

اور اسی مرض کی بدولت دنیا کے جو لطف ہم نے اٹھائے ہیں ان کو یا تو ہم جانتے ہیں یا دوسرے اہلِ اختلاج جانتے ہوں گے۔ بہتر سے بہتر غذا کھائیے ایک سے ایک لاجواب پھل اپنی تمام شادابیاں لئے ہوئے دست بستہ پلیٹ کے اندر رکھا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر رہے گا۔ انگور، انار، سیب، سنگترا، سردا

مختصر یہ کہ جملہ انواع و اقسام کے شاداب اور شیریں، مفرح اور لذیذ پھل ہوں گے۔ خوشبودار ترتراتا ہوا گاجر کا حلوا جس میں برابر کا میوہ ہوگا اور اوپر سے چاندی کے ورق۔ خوشبو ایسی کہ معدہ اپنا منہ کھول دے۔ سیب کا مربا در ورق نقرہ پیچیدہ و بخور زند۔ اعلیٰ درجہ کے ٹھنڈے، خوشبودار اور میٹھے شربت، پھر ہر ایک پر حکومت کیجئے، ہر ایک چھوٹے بڑے کو اپنے اختلاج سے مرعوب کیجئے، دفتر سے چھٹی لے کر چار پائی پر پڑے رہیئے، کہہ تو دیا کہ اختلاج کا مرض پیدا کیجئے، اور دنیا میں جنت کا لطف حاصل کیجئے، زندگی کو زندگی بنایئے، اور جنت سے جدا رہ کر جنت میں داخل ہو جایئے، یہ ہمارا ذمہ کہ اگر ایک مرتبہ بھی اختلاج کی چاٹ آپ کو لگ گئی تو پھر آپ ہی یہ دعا کریں گے کہ خدا کرے اس مرض میں افاقہ نہ ہو۔ ع

قرار ہو نہ دل بے قرار کو یارب

ہماری زندگی اور کسی حیثیت سے خواہ کتنی ہی عبرت انگیز کیوں نہ ہو مگر اس حیثیت سے یقیناً قابل رشک ہے کہ ہم بفضلہٖ اختلاج کے مریض ہیں، اور اپنے اس مرض کو ہم نے اس قدر تخویف آمیز بنا رکھا ہے کہ ہمارے لئے ہر ایک دوست بدعا رہتا ہے کہ خدا ہم کو شفائے کامل عطا فرمائے۔ مگر یہ بددعا اس لئے قبول نہیں ہوتی کہ خود ہم ہر وقت یہی دعا کرتے ہیں کہ جیتے جی اس مرض سے خدا ہم کو محروم نہ رکھے۔

شادی سے قبل اور تعلیمی زمانہ میں تو خیر اس مرض سے اتنا ہی فائدہ ہوتا تھا کہ اسکول سے چھٹی مل جاتی تھی۔ اور گھر پر پھل وغیرہ سے ہماری ہر وقت تواضع ہوتی تھی۔ مگر شادی کے بعد تو یہ پتہ چلا کہ اگر کسی فرمانبردار بیوی کے شوہر کو خدا نے

اختلاج کی دولت سے مالامال کیا ہے اور اس اختلاجی شوہر میں ذرا بھی عقل ہے تو وہ شاہی کرسکتا ہے گھر بیٹھے اور اپنا ایسا رعب قائم کرسکتا ہے۔ کہ مسولینی بھی دیکھے تو ششدر رہ جائے، ہوتا یہ ہے کہ دفتر سے آئے ہیں اور اختلاج قلب کی رعایت سے فواکہات سے ناشتہ کرنے کے بعد گاجر کے حلوے سے شغل فرما رہے ہیں۔ کہ بیگم صاحبہ نے سال رواں کا بجٹ پیش کرتے ہوئے یہ شکایت کی کہ خرچ بڑھتا ہی جاتا ہے، اور آمدنی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ وہی مقررہ تنخواہ ہے اور خرچ کی غیر محدود مدیں۔ بیماریاں ہیں کہ پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ دوا فروش کا مطالبہ بڑھتا ہی جاتا ہے، لائف انشورنس کمپنی والے صبر کرکے بیٹھ رہے ہیں اور پالیسی ختم ہوگئی ہے۔ بچوں کے اسکول کی فیس الگ کھائے جاتی ہے۔ اور اب اللہ رکھے پاس ہوئے ہیں تو نئی کتابوں کی فکر ہے۔ نوکروں کی تنخواہ کا قصہ یہ ہے کہ:۔

ہم نے بات کاٹ کر کہا:۔

"بیگم یہ تو بتاؤ کہ آخر میں کیا کروں، تم جانتی ہو کہ میں مریض ہوں۔ اپنی زندگی سے عاجز۔ جو کچھ میں کر رہا ہوں اس کو میں ہی خوب جانتا ہوں۔ میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو ہل کے پانی نہ پیتا۔"

بیگم نے عاجزی سے کہا، یہ تو ٹھیک ہے، مگر آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں اور کس سے کہوں، اب یہ دیکھیے کہ اسلم میاں کے یہاں آج ہی کل میں ولادت ہونے والی ہے۔ مجھ کو چاہئے تو یہ کہ ماں باپ اور بچے کو جوڑے دوں، اور .. .."

ہم نے الجھ کر کہا، میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں اور آپ کو جوڑوں کی پڑی ہے۔ اُف " " اُف " " اُفوہ!

ہم نے بدحواس ہو کر ٹہلنا شروع کیا اور بیگم بیٹھے بیٹھے بدحواس ہو گئیں ہم کو مصلحتاً اختلاج شروع ہوا۔ ان کا دل سچ مچ دھڑکنے لگا ہم ٹہلتے ٹہلتے چارپائی پر بیٹھے اور قمیص کے بٹن کھول کر وحشت ناک صورت بنا کر لیٹ گئے، انھوں نے خود پنکھا جھلنا شروع کیا۔ اور ملازمہ کو ہدایت کی کہ فوراً برف ملا کر بید مشک کا شربت تیار کرے۔ ملازمہ نے گھر بھر میں یہ خبر کر دی کہ میاں کو اختلاج کا دورہ ہوا ہے۔ اور گھر کا ہر چھوٹا بڑا ہماری خدمت میں حاضر ہو گیا۔ کوئی شربت پلا رہا ہے، کوئی پنکھا جھل رہا ہے۔ کوئی برف توڑ توڑ کر کھلاتا ہے۔ اور زیادہ تر لوگ بیگم کا ناطقہ بند کئے ہوئے ہیں۔ کہ آخر ہوا کیا تھا۔ اور وہ بیچاری ہیں کہ چور سی بن کر رہ گئی ہیں۔ ہر ایک ان کو ہی قصوروار سمجھ رہا ہے کہ آخر تم نے ان سے ایسی فکر پیدا کرنے والی باتیں کیں ہی کیوں؟ وہ غریب ہر ایک کو سمجھا رہی ہیں اور کانا پھوسی ہو رہی ہے۔ کسی کے ہاتھ میں آنار ہے، تو کوئی سیب لئے کھڑا ہے کسی کو خس کا عطر سنگھانے کی سوجھی ہے، تو کوئی سر سہلا رہا ہے۔ پنکھا ہے کہ برابر جھلا جا رہا ہے۔ برف ہے کہ برابر کھلائی جا رہی ہے۔ شربت ہے کہ جتنا چاہیں ہم پئیں۔ یہاں تک کہ ہم کو سکون ہوا اور ہم آنکھیں بند کر کے چپکے لیٹ رہے ہمارا مطلب تو یہ تھا کہ دن بھر کے تھکے ہوئے دفتر سے آئے ہیں ذرا دیر پنکھا جھلوا کر سو رہیں اور ہمارے تیمارداروں کی بھی یہی مرضی تھی کہ ہم کو نیند آ جائے، لہٰذا ان عشرتوں کے ساتھ ہم سو گئے۔ اور گھر بھر میں ہماری نیند کے اہتمام کے لئے سناٹا

کر دیا گیا۔ کوئی زور سے نہ بولے۔ کوئی ایڑی سے نہ چلے۔ سب پنجوں کے بل چلیں کسی برتن کو زور سے نہ رکھا جائے، کوئی دروازہ ہوا سے آواز کے ساتھ بند نہ ہو اور کوئی مکھی ہم پر نہ بیٹھے، مختصر یہ کہ کوئی ایسی بات نہ ہو کہ ہماری نیند اچاٹ ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی نیند کس کو میسر ہو سکتی ہے، ہم سوئے اور جی بھر کر آرام کی نیند سوئے، اب جو دو گھنٹہ کے بعد سو کر اٹھے تو بیگم کا طرزِ عمل ہی دوسرا تھا یا تو وہ اقتصادی مرثیہ پڑھ رہی تھیں یا ہم کو بیدار دیکھتے ہی نہایت شفقت سے بولیں:-

"سو چکے آپ؟"

ہم نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں کیا بہت دیر سویا؟"

بیگم نے کہا۔ "نہیں تو کوئی دو گھنٹہ سوئے ہوں گے آپ۔ اچھا اب کچھ کھائیے گا؟"

ہم نے تکلف سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "کچھ دل نہیں چاہتا۔"

بیگم نے کہا۔ "ایک آدھ سیب یا سنگترہ، یا یہ دیکھئے میں نے آپ کے لئے چکوترے کے کچالو بنائے ہیں۔ انگور بھی رکھے ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "پیاس معلوم ہو رہی ہے۔"

بیگم نے مدارات سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "تو پھر آپ شربت پیجئے، بتائیے نارنج کا شربت بناؤں یا صندل کا۔ یا کوئی بوتل کھلوا دوں۔"

ہم نے کہا۔ "خالی پانی پلوا دیجئے، شربت کون پیئے۔"

بیگم نے کہا۔ "اچھا تو پھر آپ لمنیڈ کی بوتل پی لیجئے۔"

ہم نے کہا "لائیے تو وہی سہی"۔

لمینیڈ کی بوتل پی کر چکوترے کے کچالو کھائے، اور اب گھر کا ہر شخص فرداً فرداً خیریت مزاج پوچھنے کے لئے آنے لگا۔ کسی نے تاش کھیلنے کا مشورہ دیا تاکہ دل بہلے تو کسی نے یہ رائے دی کہ ہم دفتر سے ایک آدھ روز کی چھٹی لے لیں۔ کسی نے تفریح کے لئے جانے کو کہا تو کسی نے کوئی ہنسی کا قصہ سنا کر دربارداری کے فرائض کو انجام دیا۔ کوئی گراموفون لے کر بیٹھ گیا۔ اور کسی نے حبش اور اٹلی کی جنگ چھیڑ دی۔ مختصر یہ کہ رات کو اس وقت تک ہمارا یہ دربار لگا رہا جب تک کہ سونے کا وقت نہیں آگیا۔ اور آخر ہم اسی شاہانہ ٹھاٹھ کے ساتھ بادشاہوں کی نیند سو گئے۔

اب چونکہ ہم کو اختلاج کا دورہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا ہمارے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ دفتر سے تین روز کی رخصت حاصل کر لی جائے، بتائیے کہ کیا برے رہے ہم اس طرح۔ پھر گھر پر یہ حال کہ اب چاہے کوئی مر ہی جائے مگر ہم کو اس کا غم اٹھانے کی زحمت کوئی نہیں دے سکتا۔ عزیز و اقربا کی اموات، بچوں کی بیماریاں خاندانی حادثات اور بیرونی سانحات کی اطلاع بھی ہم کو نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وہ زبردست سنسر بیٹھا ہے کہ مثلاً صاحبزادے صاحب نے پتنگ کے عشق میں کوٹھے کے اوپر سے پھاند کر اقدام خودکشی کیا اور گھر بھر اس حادثہ کے ماتحت بدحواس ہو گیا۔ خود بیگم کی حالت پاگلوں کی سی ہو گئی اور گھر سے لے کر باہر تک ایک کہرام مچ گیا۔ ان حضرت کی مرہم پٹی ہوئی۔ غرضیکہ سب کچھ ہو گیا مگر ہم کو اس کی خبر اس لئے نہیں ہو سکتی کہ مبادا اختلاج کے ماتحت ہمارا دم نکل جائے۔ اور وہ

صاحبزادے کا یہ حادثہ ہمارے لئے موت کا پیغام بن جائے، لیکن اگر انتہائی احتیاط کے باوجود ہم کو اس حادثہ کے متعلق کچھ علم ہو جائے اور ہم اس کے متعلق بیگم سے تصدیق کریں تو وہ اپنے وحشت ناک چہرہ کو زبردستی بشاش بنا کر۔ اپنے اضطراب کو اطمینان کے بہروپ میں پیش کرکے اپنی رونی صورت کو تبسم زا بنا کر یہ کہیں گی کہ :-

"کچھ بھی نہیں، وہ چبوترے پر سے گر پڑا اور ذرا سا ماتھا چھل گیا ہے!"

سنسر اس کو کہتے ہیں کہ کوٹھے کو چبوترا بنا دیا گیا۔ اور سر پھٹ جانے کو ماتھے کا چھلنا ظاہر کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس اطلاع کے بعد ہم کو اختلاج میں مبتلا ہونے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ورنہ اگر خدانخواستہ ہم کو اختلاج کا مرض نہ ہوتا تو یقین جانئے کہ اسی کوٹھے کو جو چبوترا ظاہر کیا گیا ہے یہی بیگم صاحبہ کوہ ایورسٹ ثابت کرتیں اور یہی سر کا پھٹنا جو ماتھے کا چھلنا بنایا گیا ہے سر کا دو حصوں میں مساوی طور پر تقسیم ہو جانا کہا جاتا۔ اور پھر ہم اس اطمینان کے ساتھ چارپائی پر لیٹ کر انگور نہ کھا رہے ہوتے۔ بلکہ صاحبزادے کے سر کے ٹوٹنے کی سزا میں ہماری ٹانگیں اس طرح توڑی جا رہی ہوتیں کہ ایک پیر گھر میں ہوتا اور ایک اسپتال میں۔ ایک طرف ڈاکٹر کے یہاں دوڑنے کا مشورہ دیا جاتا اور دوسری طرف دوافروش کے یہاں جانے کا حکم۔

کبھی بیگم کو سمجھانا پڑتا اور کبھی مجروح بچے کو، وہ کہتیں کہ خدا ہی اس کو بچا لے اور ہم کو کہنا پڑتا کہ خواہ مخواہ وہم نہ کرو۔ خدا کے فضل سے وہ بالکل

اچھا ہے، وہ کہتیں کہ خون اب تک جاری ہے اور ہم ان کو سمجھاتے کہ اس خون کا بہہ جانا ہی اچھا ہے، وہ پوچھتیں کہ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں اور ہم کو ڈاکٹروں کی طرف سے فی البدیہہ خدا جانے کیا کیا تصنیف کرنا پڑتا۔ راتوں کو بچہ کی تکلیف کی وجہ سے ہم کو جاگنا بھی پڑتا۔ بیگم کہتیں کہ میں تیمارداری کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ تو ہم کو ان کی تیمارداری شروع کرنا پڑتی۔ بیگم علاج کے سلسلہ میں روپیہ کی کمی کا رونا روتیں تو ہم کو روپیہ لانے کے لئے خدا جانے کس مقدمہ سازش میں شریک ہونے کے متعلق غور کرنا پڑتا۔ مختصر یہ کہ ایک آفت ہوئی، ایک مصیبت ہوئی۔ ایک قیامت ہوئی، مگر اب یہ معلوم ہوا ہے کہ چبوترے پر سے لڑکا گر پڑا ہے۔ اور سر ذرا سا چھل گیا ہے۔ لیجئے کوئی بات ہی نہیں ہوئی ہم خوش، ہمارا خدا خوش، ہم نے بھی بحیثیت باپ کے مشورہ دے دیا کہ ذرا سا ٹنچر لگا دینا۔ ورنہ گرمی کا زمانہ ہے کہیں مواد نہ پڑ جائے۔

اس قسم کے ایک دو نہیں سیکڑوں حادثات سے خدا ہم کو بچاتا ہے، پھر سب سے بڑی بات یہ کہ خواہ بیگم کے پاس کوئی کوڑی بھی نہ ہو اور تمام گھر کا کارخانہ قرض پر چل رہا ہو مگر وہ بیچاری یہ نہیں کہہ سکتیں کہ خرچ کی تکلیف ہے، ہماری تمام ضرورتیں تو خیر شاہانہ دریادلی کے ساتھ پوری ہوتی ہی ہیں مگر ہماری ذات کے علاوہ گھر میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا علم ہم کو اس بادشاہ کی طرح بالکل نہیں ہوتا جس کی حکومت کا تمام انتظام وزراء کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اور وہ محض شاہی کرتا ہے۔

اگر جناب ہم کو یہ مبارک مرض نہ ہوتا تو آپ جانتے ہیں کہ یہی ہماری

ہمدرد اور نیک بیوی جو بظاہر فرماں برداری کا ایک نمونہ اور شوہر کی اطاعت کی ایک قابل تقلید مثال بنی ہوئی نظر آتی ہیں کیا کرتیں، یہ ہمارا ناطقہ بند کر دیتیں اور ہماری زندگی اس حد تک وبال بنا دیتیں کہ ہم ہر وقت خودکشی کی تدابیر پر غور کرتے۔ مگر دل سے دعا نکلتی ہے اس اختلاج کے لئے کہ اس نے ہماری تمام مشکلیں آسان کر رکھی ہیں۔ اور ہماری زندگی کو تلخیوں سے قطعاً غیر متعلق بنا کر ایک فردوسی زندگی بخش رکھی ہے، گویا دشیقہ مل رہا ہے کسی شاہی خاندان کے چشم و چراغ کو۔

اب فرمایئے کہ آپ کے لئے اختلاج کا مرض پیدا ہونے کی دعا کی جائے۔ امتحاناً آپ فرضی طور پر ہی اختلاج کے مریض بن کر دیکھیے۔ کہ آپ کی کتنی آؤ بھگت ہوتی ہے، گھر بھر کا نقشہ ہی نہ بدل جائے تو اس خاکسار کو نہ کہیے گا۔

تکیہ کا غلاف

بھائی جان نے ہمارے بستر سے تکیہ اٹھا کر بھابی جان کے حضور میں پیش کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا دیکھتی ہو کتنا خوبصورت، باریک اور نفیس کام دلہن نے بنایا ہے، جی چاہتا ہے کہ دیکھتے ہی رہو!"

بیگم کی تعریف سن کر غیر ارادی طور پر ہمارے ہاتھ مونچھوں پر تاؤ دینے کے لئے اٹھ گئے، اور غیر محسوس طور پر کچھ شان سی ہم میں پیدا ہو گئی معلوم یہ ہوتا تھا کہ گویا یہ بیوی کی تعریف نہیں ہوئی ہے بلکہ ہم تو آغا خاں ہیں اور ہمارا گھوڑا ڈربی ریس میں وِن آیا ہے، مگر بھابی جان کے رخِ روشن کی طرف جو نظر اٹھی تو وہاں مرچے لے کر ناک اور پیشانی تک کی تمام کمانیاں خراب ہو چکی تھیں اور چینِ جبیں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ان کو کوئی نہایت سخت گالی دے دی گئی ہے۔ مگر بھائی جان تھے کہ تعریفوں کے پل باندھے دیتے تھے۔

"اس تکیہ کے غلاف میں خوبی یہ ہے کہ تاج محل کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس کی ایک ایک اینٹ ظاہر کر دی ہے۔ اور اس کے سامنے کی نہر اور نہر کے فوارے تو سبحان اللہ، بھئی خدا نظر بد سے بچائے، ماشاءاللہ خوب بنایا ہے۔"

بھابی جان سے آخر نہ رہا گیا۔ جل کر بولیں۔ "میں کہتی ہوں کہ آخر تم کو اور کوئی کام بھی ہے۔ بس بیٹھے ہوئے بھاوج کی تعریفوں کے پل باندھے جاؤ گے معلوم ہوتا ہے جیسے کبھی کشیدہ کاری دیکھی ہی نہیں ہے۔"

بھائی جان آدمی ہیں سخن فہم اس جلی کٹی کو فوراً سمجھ گئے۔ مگر چونکہ اس وقت صاف گوئی پر تلے ہوئے تھے۔ لہٰذا سولی پر یعنی بیوی کے سامنے بھی سچ ہی بول دیئے کہ "کشیدہ کاری دیکھی کیوں نہیں ہے مگر میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ کشیدہ کاری کی جو نزاکت اس نمونہ میں برتی گئی ہے وہ اس فن کے کمال کا درجہ رکھتی ہے۔"

بھابی جان نے اور بھی جل کر کہا۔ "اچھا خیر تمھاری بھاوج بڑی لائق سہی اور میں بڑی نالائق سہی۔" بھائی جان نے گڑبڑا کر جلدی سے کہا "یہ کس مردود نے کہا کہ تم نعوذ باللہ نالائق ہو بھئی بات یہ ہے کہ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

میرے خیال میں تم کھچڑا ایسا پکاتی ہو کہ بڑے سے بڑا باورچی بھی تمھارے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ یا جیسے بنڈے کے کچالو تم بنا لیتی ہو میں تو کہتا ہوں کہ بڑے سے بڑے لاٹ کی بیوی بھی ویسے کچالو نہیں بنا سکتی۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تکیہ کا غلاف بھی دلہن نے خوب بنایا ہے۔"

بھابی جان نے منہ چڑھا کر کہا۔ "جس کو ذرا فرصت ہو اور سوئی ہاتھ میں پکڑنا جانتی ہو وہی بنا لے گی۔ یہ تو بہت معمولی سا کام ہے۔"

بھائی جان نے کہا۔ "یہ معمولی کام ہے، اجی نہیں تم مذاق کرتی ہو۔"

بھابی جان نے کہا۔ "مذاق نہیں تو کیا بی۔ اے۔ ایم۔ اے کی ڈگری ہے جب کہو میں تم کو خود بنا کر دے دوں۔ مگر تم ہو بے ڈھنگے۔ دو دن میں تیل سے چپڑا ہوا سر رکھ کر چکٹ کر دو گے۔"

بھائی جان نے کہا۔ "تم بھی بیگم بجد الکمال ہی کرتی ہو۔ ارے بھائی اور تو خیر کچھ نہیں، لیکن اگر تم ایسا تکیہ کا غلاف بنا دو تو آج سے تمہارا غلام ہوا جاتا ہوں تم کہتی ہو تیل سے چپڑا ہوا سر رکھنے کو میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں اس کو شیشہ کے چوکھٹے میں جڑوا کر اپنے بیٹھک کے کمرے میں آویزاں کر دوں گا۔"

بھابی جان کو جو غصہ آیا تو اپنی بقچی کھول کر ہمارے تکیہ کو سامنے رکھ کر بیٹھ گئیں۔ فی البدیہ تکیہ کا غلاف فرمانے۔ بھائی جان تھوڑی دیر تو چشمہ سے نظر پھندا پھندا کر اپنی بانوئے محترم کی اس ادا کو دیکھتے رہے۔ اس کے بعد وہیں بیٹھے بیٹھے لگے اونگھنے۔ اور پھر رفتہ رفتہ خراٹے دار نیند نے ان کو غائب کر دیا۔ ہم خاموشی کے ساتھ اخبار پڑھنے لگے۔

قصہ دراصل یہ تھا کہ ہم عرصہ کے بعد دسہرہ کی تعطیل میں بھائی جان سے ملنے آئے تھے۔ اور بغیر کسی تخصیص کے بیگم نے "تکیہ پر زیر بحث غلاف بھی چڑھا دیا تھا۔ اگر اس غریب کو یہ معلوم ہوتا کہ یہی غلاف باعث "موازنہ انیس و دبیر" بن جائے گا تو قیامت تک بھائی جان سے تصادم کے لئے تیار نہ ہوتی۔ مگر یہاں تو اس تکیہ کے غلاف نے اچھا خاصا محاذ جنگ قائم کر دیا تھا۔ اور ہم بھائی جان کی افتاد طبیعت کی روشنی پر دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ خدا ہی خیر کرے۔ بھائی جان کے بے تکے پن سے ہم واقف تھے۔ کہ وہ فساد کی ایک بنیاد

قائم کرنے کے بعد اس فساد کے نتیجہ پر پہنچ کر ہمیشہ پچھتائے ہیں کہ یہ میں نے کیا کیا۔ اور وہی رنگ اس تکیہ کے غلاف کے سلسلے میں بھی ہم دیکھ رہے تھے۔ لہذا بھائی جان تو خراٹے لے رہے تھے۔ اور ہم اخبار پڑھنے کے بہانے اس وظیفہ کو پڑھ رہے تھے کہ "جل تو جلال تو صاحب کمال تو۔ آئی بلا کو ٹال تو" خدا جانے اسی عالم میں ہماری بھی کب آنکھ لگ گئی، حالانکہ ہم دن میں سونے کے عادی نہیں ہیں۔ بہر حال جب آنکھ کھلی تو چراغ جلنے کا وقت تھا۔ مگر بھائی جان بدستور وائیرلیس کا اسپیشل بنے ہوئے خراٹوں سے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ سو رہے تھے اور بھابی جان کی تمام تر توجہ اسی تکیہ کے غلاف کی جانب مبذول تھی۔

ہم نے جلدی سے اٹھ کر بھائی جان کو اٹھایا۔ اس لئے کہ اسی وقت ایک عصرانہ میں شرکت کرنا تھی۔ ان حضرت نے اٹھتے ہی پہلے تو اپنی رفیقۂ حیات کے اس انہماک کو بڑے پیار اور تمنا کی نظروں سے دیکھا۔ پھر خدا جانے کیا خیال آیا کہ ان کی کاریگری کو دیکھنے کے لئے ان کی طرف جھپٹے۔ مگر بھابی جان نے فوراً اپنے بنائے ہوئے غلاف کو زانو کے نیچے دبا کر کہا:۔

"یہ کیا میں ابھی نہ دکھاؤں گی۔ جب بالکل تیار ہو جائے، اس وقت دیکھئے گا۔"

بھائی جان ہمیشہ کے جلد باز واقع ہوئے ہیں۔ کہنے لگے "تاہم بطور نمونہ آخر کیا مضائقہ ہے۔"

بھابی جان نے کہا "اوں ہوں نہ"۔ میں ہرگز اس کی جھلک بھی نہ دکھاؤنگی آخر جلدی ہی کیا ہے۔"

ادھر بھابی جان نے یہ انکار کیا اور اُدھر ہم نے بھائی جان سے ٹی پارٹی میں چلنے کی جلدی کی۔ لہٰذا وہ بیچارے کچھ مجبور ہو گئے اور ہمارے ساتھ ٹی پارٹی میں شرکت کے لئے روانہ ہو گئے، ٹی پارٹی سے ہم لوگوں کی واپسی تو جلدی ہوئی تھی۔ مگر راستہ میں ایک بہت عمدہ فلم کا اشتہار دیکھ کر سینما کا پروگرام بن گیا۔ اور وہاں سے رات گئے واپسی ہوئی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ بھابی جان بدستور لیمپ کے سامنے بیٹھی ہوئی آنکھیں پھوڑ رہی ہیں، بھائی جان اس وقت بھی غلاف دیکھنے پر اصرار تو ضرور کرتے مگر بھوک کے غلبہ کے آگے ان کے لئے دنیا ہیچ ہوتی ہے چنانچہ آتے ہی دو زانو تخت پر بیٹھ گئے۔ اور پیٹ سہلا کر بڑی زور سے "کھانا لگاؤ" کا نعرہ بلند کر دیا۔ بھابی جان نے نہایت رازداری کے ساتھ تکیہ کے غلاف کو چھپا کر جواب دیا۔ "آج تو خدا ہی ہے جو کوئی ڈھنگ کی چیز آپ کو کھانے کے لئے مل جائے۔"

یہ کہہ کر بھابی جان باورچی خانہ تشریف لے گئیں۔ اور وہاں سے تھوڑی ہی دیر میں کھانا بھیج دیا۔ مگر اب یہ لطیفہ ہوا کہ بھائی جان نے پہلا ہی لقمہ جو منہ میں لیا ہے تو معلوم ہوا کہ کسی نے آتش بازی کے قلعہ میں دیا سلائی لگا دی منہ پیٹتے ہوئے ایک دم سے کھڑے ہو گئے اور چہرہ سرخ، بہ مشکل تمام یہ غلط فہمی دور ہو سکی کہ بچھو نے نہیں کاٹا ہے۔ بلکہ سالن دراصل مرچوں کا حریرہ ہے واقعی اس میں اس قدر مرچیں تھیں کہ خود ہم کو بھی اپنے اوپر آتش فشاں پہاڑ ہونے کا شبہ ہونے لگا۔ آخر کار سالن سے صبر کر کے کباب جو کھاتے ہیں تو معلوم ہوا کہ زندہ بکری کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں اور یکایک ہم کو

اس جہالت کی طرف پھینک دیا گیا ہے جس میں آدم خوری آؤٹ آف فیشن نہ تھی کبابوں سے بھی توبہ کی اور دال پر قناعت کرنے کا ارادہ کر کے منہ جو چلایا تو معلوم ہوا کہ سانبھر جھیل میں غوطے لگا رہے ہیں۔ یا عبور دریائے شور کی سزا بھگت رہے ہیں۔ خیر ہم تو خاموشی سے یہ مختلف مزے ہی چکھ رہے تھے مگر بھائی جان کا برا حال تھا۔ کبھی بیٹھکیں لگاتے تھے اور کبھی ڈنڈ پیلنا شروع کر دیتے تھے۔ آخر نہایت ہی جز بز ہو کر کہنے لگے۔

"میں کہتا ہوں بیگم کہ یہ آفت کیا ہے، آج تم نے نمک تک نہ چکھا۔ بس سالن تک نہ دیکھا۔ اب بتاؤ کہ میں کیا کھاؤں اور کیونکر اپنا دوزخ پاٹوں۔"

بھابی جان نے تڑ کی بہ تڑ کی کہا اب چاہے کھانا پکوا لو، چاہے غلاف بنوا لو میرے دو ہی تو ہاتھ ہیں۔ کوئی دس پانچ تو ہیں نہیں۔ کہ یہ بھی کروں اور وہ بھی۔"

بات تھی معقول اور واسطہ تھا تکیہ کے غلاف کا لہذا بھائی جان نے نہایت مجبوری کے درجہ پر پہنچ کر بالائی اور کباب منگانے کی تجویز پیش کی اور یہ اس طرح رات کو پیٹ بھر سکا۔ مگر اس کے بعد بھی اس تکیہ کے غلاف کی زیارت نصیب نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ وہ مکمل نہ تھا۔ اور ہم دونوں کو حسرت دیدار ہی میں سو جانا پڑا۔ بھابی جان بیچاری پھر اس ناشدنی غلاف کو لے کر بیٹھ گئیں۔ اور خدا جانے رات بھر کشیدہ کاری فرمائی یا کیا کیا کہ صبح جو ہم اٹھے تو وہ گویا ہماری بیداری کی منتظر بیٹھی تھیں۔ اور بھائی جان اسی انتظار میں حقہ جلائے دیتے تھے۔ ہم کو دیکھتے ہی بھابی جان نے کہا۔

"آیئے آپ دونوں اور دیکھئے غلاف کو جلدی میں جیسا بھی بنا ہے بنا دیا ہے۔"

ہم دونوں نے نہایت اشتیاق کے ساتھ غلاف کو دیکھا تو بھائی جان نے دیکھتے ہی کہا:۔

"یہ الٹا ہے، اسے سیدھا کرو۔"

بھابی جان نے کہا۔ "اے واہ۔ الٹا ہے یا سیدھا، ذرا غور سے دیکھو۔"

بھائی جان نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ سیدھا ہے اور میں فرض کئے لیتا ہوں کہ سیدھا ہی ہے تو یہ بتایئے کہ بنایا کیا ہے آپ نے۔"

بھابی جان نے کہا۔ "نہیں پہچانے اب تک۔ یہ تاج محل ہی تو ہے۔"

بھائی جان نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا، "کدھر سے ہے یہ تاج محل ذرا سمجھاؤ تو۔"

بھابی جان نے کہا۔ "بھئی اللہ، اب میں سمجھاؤں کیا۔ یہ دیکھو گنبد ہے۔"

بھائی جان نے کہا۔ "گنبد اور مینار وغیرہ سمجھ جانے کے بعد بھی میرے خیال میں تو یہ لکھنؤ کی نمائش کے مختلف پویلینوں کا ایک معجون مرکب نقشہ ہے؟"

بھابی جان نے کہا۔ "خیر تم کو میری کوئی چیز بنائی ہوئی اچھی نہیں لگتی ان کو دکھاؤ۔"

بھائی جان نے ہم سے کہا۔ "لو بھائی یہ تو دیکھو کیا ہے۔"

ہم نے دبی زبان سے کہا۔ "میرے خیال میں تو یہ تاج محل سے زیادہ

بیلی گارد معلوم ہوتا ہے یا اس وقت کا تاج محل ہے جب گولہ باری کے بعد اس کی صورت مسخ ہو جائے گی۔"

بھابی جان نے جلبلا کر غلاف اٹھا لیا۔ اور پھر اس کے متعلق کوئی گفتگو نہ کی یہاں تک کہ ہم دوپہر کو گھر روانہ ہو گئے۔ مگر گھر پہنچنے کے تیسرے روز بھائی جان کے خط سے یہ معلوم ہو کر سخت تشویش ہوئی کہ بھابی جان اسی تکیہ کے غلاف کے سلسلہ میں لڑ کر اپنے میکے چلی گئی ہیں اور کہہ گئی ہیں کہ بھائی جان کی صورت زندگی بھر نہ دیکھوں گی۔

ایک شعر

کوئی صاحب اپنے وقت کے کیسے ہی بقراط اور بحر العلوم کیوں نہ بن جائیں دنیا خواہ ان کے تبحر کے آگے سر نیاز جھکا دے اور شش جہت میں ان کی قابلیت کی چاہے جیسی بھی دھوم کیوں نہ ہو مگر خدا نہ کرے کہ وہ کبھی ان احباب میں آ کر پھنس جائیں جن سے کسی زمانہ میں دھول دھپے کے مراسم رہ چکے ہیں یا جو ان کے لنگوٹئے یاروں کی حیثیت رکھتے ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ نہ تو اس وقت ان کا وہ ادبی وقار قائم رہتا ہے اور نہ وہ عالمانہ شان ہوتی ہے اور نہ وہ دنیا کو اپنے سامنے جھکا لینے والا عالمانہ رعب و جلال ہوتا ہے، بلکہ وہ اپنے اصلی رنگ میں آجاتے ہیں۔ اگر نہیں آتے تو لائے جاتے ہیں۔ اور اگر لائے جانے کے باوجود اپنے اصلی رنگ میں آنے کے سلسلے میں ذرا بھی تکلف برتا اور کبھی شامت آجاتی ہے۔

اس رسمی تمہید کے بعد ہم آپ کا ایک ایسے باکمال شاعر سے تعارف کراتے ہیں جن کو یقیناً آپ خود جانتے ہوں گے، بلکہ یقیناً ان کا نام سن کر آپ کہیں گے کہ آخاہ آپ ہیں۔ مگر ان کے سلسلہ میں جس واقعہ کا ذکر کرنا مقصود ہے آپ محض اس سے سروکار رکھیے گا۔ ان کی شخصیت سے آپ کو کیا بحث۔ ممکن ہے کہ ان کو آپ واقعی خیام العصر، خالق جذبات، صاحب بادۂ مشرق ملک الکہکشاں وغیرہ

سمجھتے ہوں مگر ہم ان کے ان احباب میں ہیں کہ صرف ساغرؔ کہہ کر پکارتے ہیں اور وہ بھی ہمارے تمام اعزاز و احترام کو بھول کر صرف شوکت کہتے ہیں، نہ حضرت نہ مولانا نہ تھانوی نہ مدظلہ العالی۔ بہرحال مقصد صرف یہ ہے کہ یہ تعلقات "تو تو میں میں" والے ہیں اور آج سے نہیں بلکہ ہوش کی آنکھ کھولنے کے دوسرے یا تیسرے دن سے شروع ہو کر آج تک قائم ہیں صرف ایک مرتبہ وہ ذرا بنے تھے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

آپ کا صحیفۂ گرامی دہلی سے موصول ہوا۔ "تائی ڈیر شوکت میں ہاوڑہ ایکسپریس سے ۲۸ نومبر کو لکھنؤ پہنچ رہا ہوں، اسٹیشن پر آپ اگر مل گئے تو مسرت ہوگی۔ قیام غالباً پرنس ہوٹل میں ہوگا۔ والسلام۔ ساغر نظامی۔

آپ کا یہ مکتوب گرامی پورے ایک سال بعد موصول ہوا تھا اور وہ بھی اس قدر باضابطہ کہ گویا "ع پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں" معلوم ہوتا ہے کہ کسی آئی۔ سی۔ ایس نے اپنے کسی پراونشل سروس کے دوست نما ماتحت کو یہ خط نما حکم ارسال فرمایا ہے، ہم نے اس خط کو پڑھا اور دل ہی دل میں کہا کہ "ہو کچھ گھاس چر گیا ہے معلوم ہوتا ہے"۔ اس کے بعد فوراً یہ خط لے کر کلب پہنچے۔ رفیع احمد خاں، رؤف صاحب، یوسف۔ عالمگیر سب کو یہ خط دکھایا۔ جو دیکھتا تھا ایک نئی بات کہتا تھا، ایک نے کہا باجلاس کونسل لکھا ہوا آرڈیننس ہے دوسرے نے کہا۔ دہلی کے قلعۂ معلےٰ سے خط لکھا ہے ناشاہی فرمان کی شان آگئی۔ تیسرے صاحب بولے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مشاعرہ میں تعریف زیادہ ہوگئی ہے، چوتھے صاحب نے کہا کسی نے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے

کہ آپ بھی کچھ ہیں بس دماغ خراب ہوگیا۔ مگر آخر میں سب کی رائے یہ ہوئی کہ اسٹیشن پر لینے تو سب چلیں مگر سب لئے دیئے رہیں اور دیکھیں کہ ایک سال میں یہ حضرت کیا سے کیا ہوگئے ہیں۔ ہوٹل میں ٹھہرنے کی قطعاً مخالفت نہ کی جائے۔ البتہ یہ کیا جائے کہ لکھنؤ میں ہر اس موقع پر جہاں یہ شخص بننا شروع کرے اس کو فوراً شکست دے دی جائے۔

رفیع احمد خاں نے کہا "نہیں ہر موقع پر نہیں، صرف اس وقت جب وہ شاعر بنتے ہوئے معبودیت کی غلط فہمی میں مبتلا ہوں!"

یوسف نے کہا۔ "ارے سخت بگڑے گا!"

عالمگیر نے کہا "یہی تو ہم بھی چاہتے ہیں!"

مختصر یہ کہ یہاں ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم ہوگیا اور سازش تکمیل کو پہنچا دی گئی، تاریخ مقررہ پر ہمارے دوست تشریف لائے، مگر جدّت یہ تھی کہ جیسا ان حضرت نے اپنے کو خط میں پیش کیا تھا ویسے نہ تھے بلکہ اچھے خاصے معمر آدمی تھے۔ جھپٹ کر سب سے لپٹ گئے، کسی نے ان کے گھونسہ رسید کیا، کسی کے پیچھے وہ دوڑے۔ اور آخر اسٹیشن سے آدمیوں کی طرح گھر آگئے ہوٹل کا ذکر تک نہیں کیا۔ لہٰذا ہم لوگوں کی تمام اسکیم دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ دوسرے یا تیسرے روز آپ کی لکھنؤ میں آمد کے سلسلے میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس لئے کہ آپ شاعر ہیں اور اپنی قسم کے واحد شاعر ہیں، خوب کہتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشاعرہ میں آپ کی پرستش شروع ہوگئی۔ ہم بھی خوش تھے کہ ہمارا دوست اچھالا جا رہا ہے، مگر جناب ہر بات کی

ایک حد ہوتی ہے، تمام رات کی نیندان حضرت نے حرام کر دی۔ ہم خود بھی شعر کہتے ہیں مگر نہ ایسے جان لیوا شاعر ہیں نہ ایسے زندگی سے بیزار سخن فہم حد یہ کہ ناطقہ بند ہو گیا۔ یہاں تک کہ پہلے تو تعریفیں کر رہے تھے پھر چپ ہو گئے آخر پہلو بدلنا شروع کیا۔ اور بدرجہ مجبوری کوسنے پر نوبت آ گئی، مگر یہ بندۂ خدا صبح تک پڑھتا ہی رہا، نہ آواز تھکی، نہ حافظہ کو نیند آئی۔ اور نہ ہم کو موت نے پوچھا۔ بہرحال صبح گھر لوٹ آئے۔ تو آپ نے بجائے اس کے کہ ہم سب سے سمع خراشی کی معذرت چاہتے اپنی شاعرانہ فرعونیت میں کہا "آج تم لوگوں نے مار ڈالا!" رفیع احمد خاں نے کہا "یار تم ہو بھی ایسی ہی چیز کہ مار ڈالے جاؤ"

یوسف نے کہا۔ واللہ قیامت یہ ہے کہ ان کو حاضرین اس وقت [illegible]ڈنے پر بخوشی آمادہ نہ تھے۔

عالمگیر نے کہا۔ تیرے سر کی قسم بھائی ساغر تمام مجمع کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا کسی نے رات بھر پہلو تک نہیں بدلا۔

ہم نے کہا۔ "مگر یار تمہارا وہ شعر خوب تھا"

ساغر نے فوراً ہماری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "کونسا شعر؟ کیا تم ایسے بدتمیز بھی متاثر ہوئے؟"

ہم نے کہا واقعی تمہارے اشعار پر متاثر ہونا بدتمیزی کے سوا اور کیا ہے۔ مگر وہ شعر تھا خوب ؎

اہانت ہو حقارت ہو مگر پھر بھی یہ حسرت ہے
بطورِ خاص وہ اک دن اٹھائے اپنی محفل سے

ساغر نے آنکھیں آسمان کی طرف چڑھا کر ذرا جھومتے ہوئے بالوں کو درست کرنے کی بجائے الجھا کر کہا:-

"ہائے ہائے ——— اہانت ہو ——— حقارت ——— حقارت
——— حقارت ہو ——— مگر پھر بھی ——— پھر بھی ——— یہ حسرت ہے
——— بطورِ خاص وہ اک دن اٹھائے اپنی محفل سے۔

ہم نے کہا "جی ہاں اور کیا"

ساغر نے کہا "کیا مطلب اس سے"

ہم نے کہا مطلب یہ کہ اس وقت یہ شعر انعامی معمہ ہے، حاضرین میں سے جو صاحب سب سے بہتر اس شعر کے معنی بیان کریں گے ان کے اعزاز میں آج شام کو میری طرف سے ایٹ ہوم دیا جائے گا۔

ساغر نے کہا "گویا آپ پھر بدمعاشی پر اتر آئے، اس شعر و سخن کے سلسلے میں بھی بے ادبی؟"

ہم نے کہا اور شعر و سخن بھی وہ جس کا تعلق جناب سے ہو۔ توبہ توبہ جہنم کا دروازہ کھل چکا ہے ہم سب زندیقوں کے لئے۔

ساغر نے کہا، بے شک ؏ گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی۔

رفیع احمد خاں نے کہا۔ مگر سنو تو سہی اگر یہ انعامی معمہ ہے تو سب کو کاغذ اور قلم مہیا کرو تاکہ تحریری مطلب بیان کیا جائے۔ وہ زیادہ مناسب ہوگا۔ اور سب دل لگا کر اس امتحان میں کامیاب ہونے کی کوشش بھی کریں گے۔

سب نے اس تجویز کو بے حد پسند کیا۔ اور آخر کار رسوائے صاحب شعر

یعنی شاعر بےکس بیچارے ساغر کے اور سب کو ایک ایک پرچہ تقسیم کر دیا گیا۔ سب نے اس امتحان کے پرچہ کو حل کرنا شروع کر دیا۔ اور ساغر صاحب احتجاجاً اصغر علی محمد علی تاجر عطر چوک لکھنؤ کے یہاں کی فہرست عطریات پڑھنے یا سونگھنے لگے۔

پرچہ کا مقررہ وقت صرف آدھ گھنٹہ تھا۔ لہذا اسی وقت کے اندر تمام جوابات موصول ہو گئے جو نمبروار درج ذیل ہیں۔

(۱) شاعر کہتا ہے

اہانت ہو حقارت ہو مگر پھر بھی یہ حسرت ہے
بطورِ خاص وہ اک دن اٹھائے اپنی محفل سے

یعنی خواہ ہماری عزت اور آبرو پر کیسا ہی پانی کیوں نہ پھر جائے اور خواہ بھری محفل میں کیسی ہی توہین کیوں نہ ہو مگر ہماری تمنا یہ ہے کہ وہ اپنی محفل سے ہم کو اس طرح نکالے کہ دنیا خلد سے آدم کا نکلنا اور "بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے" دونوں کو بھول جائے۔ بلکہ اس کے بجائے یہ کہا جائے کہ بہت بے آبرو کر کے تو نے اپنی محفل سے ہم کو نکالا یعنی "نکلے اور نکالا" "بے آبرو ہو کر" اور "بے آبرو کر کے" کا فرق پیدا ہو جائے۔

(۲) شاعر کے شعر میں صرف لفظ "بطور خاص" قابل ذکر ہے اور اس معمولی سی ترکیب میں ایک دنیا۔ ایک کائنات اور دنیا و مافیہا سب ہی کچھ سمیٹ کر بھر دیا گیا ہے۔ بطور خاص نکالنا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ صرف یہ کہہ دے کہ "صاحب آپ یہاں سے تشریف لے جائیے" بطور خاص اس

طرح بھی نکالا جا سکتا ہے کہ ان کے دست ناز پیرا میں عاشق کی گردن ہو اور عاشق کا منہ طرف دروازہ کے اور نیت واسطے نکل جانے کے ہو۔ بطور خاص اس طرح بھی نکالا جا سکتا ہے کہ وہ یہ کہہ کر دوٹے کر جاتا ہے یا کچھ لے گا مختصر یہ کہ نوکروں کی معرفت، رقیبوں کے ہاتھوں اور بے اعتنائی کے ماتحت تو آپ خیر نکلتے ہی رہے ہیں مگر اب یہ چاہتے ہیں کہ وہ خود آپ کو نکالیں اور بطور خاص نکالیں۔

(۳) اس شعر میں کہنے والے نے کہا ہے کہ اہانت ہو یا حقارت ان دونوں کی تو خیر پروا نہیں ہے مگر چاہتے یہ ہیں کہ وہ جس طرح روزانہ یوں ہی عام مجمع کے ساتھ ہم کو بھی اپنی محفل سے غیر مدعو حضرات کی طرح نکال دیتا ہے، اس کے بجائے ایک دن یہ کرے کہ سب کو تو نکال دے اور ہمارا گریبان پکڑ کر تمام حاضرین محفل کے سامنے لے جائے اور کہے کہ دیکھئے اس بے غیرت، بے حیا اور بدتمیز کو کہ میں روزانہ اس کو اس محفل سے نکلواتا ہوں مگر یہ کسی طرح نہیں مانتا۔ آج میں اس کو نکالنے سے پہلے آپ سب کو گواہ بناتا ہوں اور اس کے بعد اپنی محفل سے خود کان پکڑ کے اٹھائے دیتا ہوں تاکہ آپ اس کو یاد رکھ سکیں اور جب کل پھر یہ اس محفل میں آئے تو آپ پہچان جائیں۔

(۴) اس شعر کو نئی روشنی میں دیکھنے کی ضرورت ہے اس لئے کہ شاعر زمانہ حال کی صنعت ہے اس نے اس شعر میں کہا ہے کہ محفل سے اٹھانے یا اٹھوانے کے تمام پرانے طریقے متروک کر کے کاش وہ محفل آرا ہم کو اس طرح بطور خاص اپنی محفل سے نکالے کہ اپنے ذاتی کتے کا پٹہ کھول کر ہماری طرف اشارہ کرے اور

ہش کہہ کر چپ ہو رہے، کتا ہم پر جھپٹے۔ اور ہم سر پہ پیر رکھ کر محفل سے نکل بھاگیں اور کتا بطور خاص ہماری جان کا دشمن ہو کر ہمارا تعاقب کرے۔ اس سے زیادہ خاص صورت اس زمانہ کا محبوب اور کیا اختیار کر سکتا ہے۔

یہ چاروں مفہوم یکجا کر کے اس پرچہ کے ساتھ ساغر صاحب کو دے دیے گئے، یہ تلافی ہے اس داد کی جو رات بھر مشاعرہ میں تم نے حاصل کر کے اپنا دماغ خراب کیا اور ہماری نیند حرام کی۔

ساغر آفتاب کے نکلنے کے وقت ہم لوگوں کی بدمذاقی پر آتش زیر پا ہو رہے تھے۔ اور ہم سب اپنے اپنے مفہوم کو ایک دوسرے سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ڈبلو۔ ٹی

شعرا، اگر اپنی جیب سے کرایہ صرف کر کے مشاعروں میں شرکت کے لئے سفر کرتے رہیں تو یقین جانئے کہ خواہ ان کی کیسی ہی حیثیت کیوں نہ ہو مگر وہ زیادہ عرصہ تک اس بار کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ خصوصاً ہمارے ایسے سفید پوش تو بہت جلد بھیک مانگنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ اگر سیکنڈ کلاس کا کرایہ ملے تو سیکنڈ ہی کلاس میں سفر بھی کیا جائے ہماری رائے تو یہ ہے کہ اس میں بھی بچت کی صورت نکالی جا سکتی ہے، اور کفایت شعاری کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ضرور بچت کی صورت نکالی جائے۔ چنانچہ ہم تو اس قسم کے مواقع پر بھی تیسرے درجہ سے کبھی آگے نہیں بڑھتے۔ اور تیسرے درجہ میں بھی اس لئے سفر کرتے ہیں کہ کوئی چوتھا درجہ نہیں ہوتا۔ مگر اب اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں کہ ہم جو بریلی کے مشاعرہ کے لئے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم پر پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک اور ہمعصر شاعر صاحب پہلے ہی سے سیکنڈ کلاس کے سامنے ٹہل رہے ہیں۔ ہم فوراً ایک قلی کی آڑ میں چھپ گئے تا کہ نظر بچا کر کسی تھرڈ کلاس میں گھس جائیں۔ اور پھر بریلی تک ان سے آنکھیں چار نہ ہوں مگر ان حضرت نے غالباً ہم کو پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ وہیں سے بڑی گرمجوشی کے ساتھ آواز دی اور ہم کو بھی اسی گرمجوشی کے ساتھ بڑھ کر ہاتھ ملانا پڑا۔ اس

کے بعد وہ مشاعرہ کے متعلق گفتگو کرتے رہے اور ہم یہ سوچتے رہے کہ اب آخر ہوگا کیا؟ اگر ٹکٹ کے بقیہ دام صرف نہ ہو چکے ہوتے تو یہ ممکن تھا کہ ٹکٹ بدلوا لیتے مگر اس وقت تو کچھ اقتصادی مجبوری ایسی تھی کہ ہم ٹکٹ تبدیل نہیں کر سکتے تھے، اور یہ حضرت ایسے عقل کے دشمن کہ سکنڈ کلاس کا کرایہ ملا تھا تو واقعی سکنڈ کلاس ہی میں جا رہے تھے، دراصل اس وقت ہماری پوزیشن سخت خطرہ میں پڑی ہوئی تھی اگر ہم ان سے صاف صاف یہ کہہ دیتے کہ ہم نے سیکنڈ کلاس کے بجائے تھرڈ ہی کا ٹکٹ لیا ہے تو وہ ہم کو خدا جانے کس قدر ذلیل سمجھتے اور اگر تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر سیکنڈ کلاس میں جاتے تھے تو ٹکٹ کلکٹر کے ہاتھوں معلوم نہیں کیا ذلیل ہوتی۔ ہم اسی شش و پنج میں مبتلا تھے کہ گارڈ نے سیٹی دی اور ہمارے شریک سفر نے ٹرین میں داخل ہوتے ہوئے کہا: "تشریف لائیے!"

ہم کچھ سٹپٹا سے گئے، اور جلدی میں ان سے کہا۔ "میں اگلے ڈبہ میں بیٹھ رہا ہوں!"

شریک سفر نے جلدی سے واپس آتے ہوئے کہا: "کیوں۔ آخر کیوں۔ اچھا چلئے میں بھی وہیں بیٹھ جاؤں گا تاکہ ساتھ تو رہے۔"

ہم اور بھی گھبرائے اور آخر ہم اسی سیکنڈ کلاس میں یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ "اچھا یہیں سہی!"

اب ذرا ہماری حالت کا اندازہ کیجئے کہ جیب میں تھرڈ کلاس کا ٹکٹ ہے اور بیٹھے ہیں سیکنڈ کلاس میں۔ وہ بھی تنہا نہیں بلکہ ایک ہمعصر کے ساتھ جو اب تک ہمارے متعلق نہایت بلند خیالات رکھتا ہے، اس کے علاوہ ایک معزز خاتون

بھی اسی ڈبہ میں تشریف فرما ہیں۔ گویا اس وقت اگر ٹکٹ کلکٹر آجائے تو ایک خوبصورت عورت اور ایک ہمعصر کے سامنے ہماری اس تمام سیکنڈ کلاسیت کا بھانڈا اس بری طرح پھوٹے کہ پھر ہم منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ یقین جانئے کہ یہ دھڑکا ایسا لگا ہوا تھا کہ سیکنڈ کلاس کا پنکھا بھی ہمارا پسینہ خشک کرنے سے قاصر تھا۔ اور جس بے لطفی کے ساتھ ہم اس وقت اس سیکنڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ وہ بے لطفی یقیناً تھرڈ کلاس میں نہ ہوتی۔ ارادہ یہ تھا کہ ٹرین میں بیٹھنے کے بعد اپنی غزل پر نظر ثانی کریں گے، اور ذرا فکر ہو جائے گی مگر اس وقت تو ہم صرف ٹکٹ کلکٹر کی شان میں ایک قصیدہ اور وہ بھی ناموزوں کہنے کے قابل رہ گئے تھے اس پر مصیبت یہ تھی کہ ہمارے شریک سفر صاحب دماغ کھائے جاتے تھے اور ایسی بے تکلفی کے ساتھ غیر متعلق بکواس فرما رہے تھے۔ کہ ان کا ہر لفظ زنجیر کھینچ کر ٹرین کو ٹھہرا لینے کے قابل تھا۔ مگر ہم اس وقت اپنی چوری کو چھپانے کے لئے ان کی ہر بات کا جواب ہاں ہوں میں دیئے جاتے تھے۔ یقین جانئے کہ اگر اس وقت ہمارے پاس سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ ہوتا تو شریک سفر خاتون کے روح افزا حسن سے کچھ نہ کچھ دلچسپی لیتے اور ان کو پیش نظر رکھ کر وہ رومانی غزل کہتے کہ مشاعرہ ہمارے ہی ہاتھ رہتا۔ مگر اس وقت تو وہ خاتون بھی ہم کو سیاہ وردی والا بھوت نما ٹکٹ کلکٹر نظر آرہی تھی۔ اور جس طرف بھی ہماری نظر اٹھتی تھی ٹکٹ کلکٹر ہی ٹکٹ کلکٹر نظر آتا تھا۔ جب تک ٹرین چلتی رہتی تھی اس وقت تک تو خیر ہم کسی نہ کسی طرح اپنا غم غلط کرنے کے لئے اپنے شریک سفر کی باتوں ہی کا جواب دیئے رہتے تھے۔ اور یہ خیال ذرا قلب کے لئے باعث سکون ہوتا تھا کہ اس چلتی

ٹرین میں ٹکٹ کلکٹر ہم پر حملہ نہیں کر سکتا۔ مگر جہاں کہیں ٹرین کسی سٹیشن پر ٹھہری بس یہ سمجھ لیجئے کہ ہمارے قلب کی حرکت اسی کی رفتار کے مطابق تیز ہو جاتی تھی۔ اور ہماری نگاہیں اپنی پوری وحشت کے ساتھ ادھر ادھر ٹکٹ کلکٹر کو ڈھونڈتی تھیں۔ کہ ہم اس کو دیکھتے رہیں تاکہ اگر وہ ہم پر جھپٹے تو ہم بھی جان بچانے کے لئے کوئی صورت اختیار کریں۔

سندیلہ کے اسٹیشن پر ٹرین کے ٹھہرتے ہی ہماری شریک سفر خاتون نے نہایت اخلاق کے ساتھ ہم سے کہا۔ "کیا آپ براہ کرم ایک روپیہ کے لڈو خرید دیں گے"

ہم اس وقت اس خیال میں کھوئے ہوئے تھے۔ کہ اگر ٹکٹ کلکٹر کو دور آتا ہوا دیکھیں گے تو فوراً غسل خانہ میں گھس جائیں گے۔ خاتون کے ان الفاظ نے گویا ہم کو بیدار کر دیا۔ اور ہم نے گڑبڑا کر کہا۔ "کیا فرمایا ایک لڈو کے روپے لے دوں"

خاتون بجائے جواب دینے کے کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔ اور ہمارے شریک سفر کو بھی لمینڈ کا اچھو ہو گیا۔ مگر ہم یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ آخر یہ دونوں کیوں ہنس رہے ہیں۔ آخر خاتون نے اپنی ہنسی کو روکتے ہوئے کہا۔ "ایک لڈو کے روپے نہیں بلکہ ایک روپے کے لڈو۔"

اب ہم سمجھے کہ یہ لوگ کیوں ہنسے تھے۔ چنانچہ خود بھی اخلاقاً ہنستے ہوئے ہم نے پلیٹ فارم پر آکر خاتون کے لئے لڈو لئے۔ مگر لڈو لے کے چلے ہی تھے کہ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک موٹا سا کالا کالا نہایت خوفناک ٹکٹ کلکٹر بالکل ہمارے

قریب سے گذر گیا۔ یقین جانئے کہ لڈوؤں کی ہانڈی ہمارے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچی اور ایک خوفناک چیخ مارے دہشت کے ہمارے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ ٹکٹ کلکٹر کے گذر جانے کے بعد ہم نے اپنے کو اس طرح محفوظ پایا کہ جس طرح کوئی شخص عین اپنے سر پر بجلی گرنے کے بعد اپنے کو محفوظ پائے اور اپنے بال بال بچ جانے کا اس کو یقین نہ آئے، ہم نے اپنے دل میں کہا۔ ع

"رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"

مگر دل نے کہا۔ ع

"آج آفت سے بچی جان تو کل خیر نہیں"

بہر حال ہم نے لڈوؤں کی ہانڈی شریک سفر خاتون کو دے دی اور خود اپنی جگہ پر بیٹھ کر موت کے انتظار میں مصروف ہو گئے، مگر خدا کا شکر ہے کہ سندیلہ کے اسٹیشن سے ٹرین بخیریت تمام گذر گئی، اور ہم کو خدا نے اپنے اس عذاب سے بچا لیا۔ جس کو ریلوے کی اصطلاح میں ٹکٹ کلکٹر کہتے ہیں۔ اب ٹرین اپنی رفتار کے جوہر دکھا رہی تھی۔ ہمارے شریک سفر شاعر صاحب رات کو مشاعرہ میں جاگنے کے خیال سے سونے کی مشق کر رہے تھے۔ شریک سفر خاتون کھڑکی سے باہر منہ نکالے ہوئے اپنے سنہری بال ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ اور ہم یہی غور کر رہے تھے کہ یہ ٹکٹ کلکٹر کیسا خوفناک ہے کس قدر موٹا ہے اور کیسا بھیانک قسم کا سیاہ فام بالکل کالا کافر نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا چہرہ اس قدر خشک اور منحوس ہے کہ اگر اس نے ہم کو پکڑ لیا تو ہرگز نہ چھوڑے گا۔ ذہن میں عجیب عجیب خیالات آ رہے تھے۔ کہ اب کی اسٹیشن پر وہ ہمارے ڈبہ میں آئے گا

تو پہلے خاتون کا ٹکٹ دیکھے گا۔ پھر ہمارے شریک سفر شاعر صاحب کا ٹکٹ اور آخر میں جب ہم سے ٹکٹ مانگے گا۔ تو ہم کیا کہیں گے؟ اگر ٹکٹ گرنے کا بہانہ کیا تو وہ سمجھے گا۔ کہ تم جھوٹے ہو۔ اگر جلدی میں ٹکٹ نہ لینے کا عذر کیا تو وہ دام مانگے گا اور جب ہمارے پاس دام نہ ہوں گے تو وہ سب کے سامنے ہمارے جامدانی کے انگرکھے، باریک کرتے اور جالی دار بنیائن کا حوالہ دے کر کہے گا کہ کیا یہ سب مانگے کے ہیں۔ مختصر یہ کہ نہایت تذلیل کے ساتھ ہم کو اتار دے گا۔ اور کیا عجب ہے کہ پولیس کے حوالے کر دے۔ اس قسم کے خیالات سے جسم کا خون کس قدر خشک ہوتا ہے اس کا اندازہ کچھ اہل دل ہی خوب کر سکتے ہیں۔ بہرحال ہم ان ہی خیالات میں مستغرق تھے کہ ٹرین بالامئو سٹیشن پر ٹھہر گئی، اور سینہ کے اندر ہی اندر دل نے اس قدر تیزی کے ساتھ اچھلنا شروع کر دیا کہ ہم خود دل کی رفتار کے ساتھ کچھ متحرک سے ہو گئے۔ اس وقت ہم ٹکٹ کلکٹر سے محفوظ رہنے کے لئے خدا جانے کیا کیا دعائیں پڑھ رہے تھے، اور دعاؤں کا حال یہ تھا کہ درود شریف کے درمیان آیۃ الکرسی کا کچھ حصہ پڑھ گئے تو کبھی دعائے گنج العرش اور عہد نامہ کو ملا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ مختصر یہ کہ اس وقت سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم عربی میں بڑبڑا ہیں خواہ بدحواسی میں جو کچھ ہم بڑبڑا رہے ہیں اس کا مفہوم پیدا ہو یا نہ ہو۔ ہم اسی عالم میں اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ دیکھتے کیا ہیں وہی کالا دیو ایک خوفناک سیاہ آندھی کی طرح ہمارے ڈبے کی طرف آ رہا ہے۔ اب ہمارے تمام جسم میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ اور ہم نے بمشکل تمام اپنی جگہ سے اٹھ کر غسلخانے کا دروازہ کھولا۔ اور اس کے اندر پہنچکر

اندر سے بند کر کے اپنے کو گویا بالکل محفوظ کر لیا۔ مگر اب جو مڑ کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ٹکٹ کلکٹر ہم کو زیر لب گالیاں دیتا ہوا دوسری طرف سے آ رہا ہے ہم فوراً ٹھٹھک کر رہ گئے، مگر اسی وقت سمجھ میں آ گیا کہ ٹکٹ کلکٹر نہیں بلکہ آئینہ میں اپنا ہی عکس ہے۔ ہم اسی غسلخانہ میں اس وقت تک بند رہے جب تک کہ ٹرین روانہ نہیں ہوئی اور ٹرین کی روانگی کے بعد جب ہم نے اندر ہی سے جھانک کر اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ وہ خطرہ اس ڈبہ میں نہیں ہے تو باہر نکل کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ مگر اس مرتبہ بھی بچ جانے کے باوجود ہمارا دل گواہی دے رہا تھا کہ ہماری موت سر پر منڈلا رہی ہے اور موت برحق ہو یا نہ ہو، مگر آج ٹکٹ کلکٹر کے ہاتھوں ہماری تذلیل برحق تھی۔ اور یہ تذلیل بھی ایسی کہ ہم ایک ہمعصر کی نظروں میں ذلیل ہوں گے۔ اور یہ ایک خوبصورت عورت ہم پر حقارت کے ساتھ ہنسے گی۔ ہم ان ہی خیالات میں مستغرق اور بالکل کھوئے ہوئے سے بیٹھے تھے، اور ٹرین اس طرح راستہ طے کر رہی تھی کہ گویا ہماری تباہیوں سے قریب ہوتی جاتی ہے اور نہایت تیزی سے ہم کو اس منزل کی طرف لئے جا رہی ہے جہاں ہم کو اخلاقی موت مرنا ہے۔ آخر ٹرین کی رفتار کم ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹرین ہردوئی کے اسٹیشن پر آ کر ٹھہر گئی، اب ہماری پھر وہی کیفیت تھی یعنی دل بیٹھا جا رہا تھا اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ اختلاج کا یہ دورہ ہمارے دل کی حرکت ایک دم بند کر دے گا۔ ہم اسی عالم میں مبتلا تھے کہ یکایک ہماری موت سر پر آ گئی، اس پھرتی اور ناگہانی طور پر کہ ہم نے ٹکٹ کلکٹر

کو ایک پھنکاریں مارتے ہوئے اژدھے کی طرح بالکل اپنے سر پر پایا۔ ہم نے دیکھا کہ خاتون نے اپنا بٹوہ کھول کر ٹکٹ نکالا اور ٹکٹ کلکٹر کے حوالے کر دیا۔ اس وقت بالکل الہامی طور پر ہمارے ذہن میں خیال آیا کہ سکنڈ کلاس کے سوئے ہوئے مسافر کو جگا کر ٹکٹ نہیں لیا جاتا۔ لہٰذا ہم بغیر اور کچھ سوچے ہوئے یکا یک اوندھ گئے۔ ٹکٹ کلکٹر نے ہمارے شریک سفر شاعر صاحب سے ٹکٹ طلب کیا اور اس کے بعد وہ ہمارے پاس آیا۔ مگر ہم تو گویا سو رہے تھے۔ لہٰذا وہ ٹکٹ کیونکر مانگ سکتا تھا۔ مگر اس نے ہمارا گھٹنا پکڑ کر ہلایا۔

"جناب ٹکٹ دکھا دیجیے۔"

مگر جناب اس دنیا میں ہوں تو جواب دیں۔ اس نے پھر کہا "بابو جی ٹکٹ دکھا دیجیے۔"

ہماری طرف سے پھر کوئی جواب نہ ملا۔ ٹکٹ کلکٹر نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔ مگر ہم تو گویا ندارد تھے۔ آخر ہمارے شریک سفر نے کہا۔

"ابھی تو اچھے خاصے بیٹھے تھے۔"

خاتون نے کہا۔ "جی ہاں، ابھی بالکل اچھے خاصے بیٹھے تھے۔"

ٹکٹ کلکٹر نے کہا۔ "مگر کیسی بے ہوشی کی نیند ہے۔"

خاتون نے کہا۔ یہ نیند نہیں ہو سکتی۔ ابھی جاگ رہے تھے۔ اس قدر جلد ایسی گہری نیند کیسے سو گئے۔"

ہمارے شریک سفر نے کہا۔ "ان کی طبیعت کچھ بے کیف سی پہلے سے تھی۔"

ٹکٹ کلکٹر نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر کہا: "ہاتھ بالکل ٹھنڈا ہے۔" یہ کہہ کر پھر ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا: "بابو صاحب جناب بابو صاحب!"

مگر ہم نے کوئی جواب نہ دیا اور جواب دیتے تو کیونکر! آخر وہ خاتون اپنی جگہ سے اُٹھ کر آئی اور ہمارے سینے پر ہاتھ رکھا۔ آہ وہ ملائم ہاتھ اور ہمارے سینے پر مگر یقین جانئے کہ اس وقت ٹکٹ کلکٹر کے پھاوڑا نما ہاتھوں اور ان روئی کے گالوں میں بھی کوئی امتیاز نہ ہو رہا تھا۔ ہم بدستور بے حس و حرکت لیٹے رہے۔ آخر خاتون نے بار بار ہمارے قلب کی حرکت کا اندازہ کرتے ہوئے کہا:۔ "بے ہوش ہو گئے ہیں!"

ٹرین چھوٹ چکی تھی۔ اور ہم بدستور پڑے ہوئے تھے۔ بیہوشی کا نام سنتے ہی ٹکٹ کلکٹر نے کہا: "کیا کہا بے ہوش ہو گئے ہیں!"

خاتون نے جھپٹ کر اپنے بیگ سے آلہ نکال کر کانوں میں لگایا۔ اور ہمارے سینے پر رکھ کر دیکھنا شروع کیا۔ اب معلوم ہوا کہ ہماری چارہ گر واقعی کوئی لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ خاتون نے دیکھنے کے بعد کہا:۔

"قلب بے حد کمزور ہے!"

ٹکٹ کلکٹر نے کہا۔ ان کو کیونکر ہوش میں لایا جا سکتا ہے۔

خاتون نے کہا: "اب شاہجہاں پور میں ان کو میڈیکل ایڈ دی جا سکتی ہے۔ خواہ میرے ہسپتال میں بھیج دیجیے۔"

ہم دراصل آج تک کسی لیڈی ڈاکٹر کے زیر علاج نہ رہے تھے مگر شاہجہاں پور میں لیڈی ڈاکٹر مس فیروزہ ہماری معالج تھیں۔

اور ہم اس طرح ان کی دوائیں پی رہے تھے کہ گویا اتفاق سے کسی نسوانی مرض میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ دوسرے دن بخیریت تمام لکھنؤ آگئے اور اپنی جیب سے مشاعرہ کا کرایہ واپس کرنا پڑا۔

کرفیو آرڈر

عادتاً بدمعاش ہونا اور مجرمانہ طریقہ پر بیوی کو مرعوب کر لینا تو خیر دوسری بات ہے ورنہ عام طور پر تمام شرفاء اپنی ہوم گورنمنٹ کے نافذ کئے ہوئے اس کرفیو آرڈر کی پابندی کرتے ہیں جو سات بجے شام سے صبح چھ بجے تک گھر سے نہ نکلنے کے لئے ان پر عائد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان شرفاء میں سے ایک ہم بھی ہیں اور چونکہ ہم قطعاً بدمعاش۔ آوارہ گرد اور مجرمانہ ذہنیت کے انسان نہیں ہیں۔ لہٰذا اس کرفیو آرڈر کی کلیتہً تعمیل کرتے ہیں۔ البتہ اگر کبھی کبھی خلاف ورزی ہو جاتی ہے تو ہمارا ہی دل خوب جانتا ہے کہ ہم پر کیا گزرتی ہے۔

کل اتفاق سے شہاب راستہ بھول کر ہمارے دفتر آ نکلے۔ یہ حضرت ابھی "واحد حاضر" ہیں۔ شادیاں متعدد ٹھہر چکی ہیں۔ مگر نکاح اب تک کہیں نہیں ہوا ہے۔ اس لئے کہ سب ہی کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ لڑکا کچھ لاابالی ہے۔ اور کچھ آوارہ گرد بھی" حالانکہ ہم نے جہاں تک ان حضرت کا مطالعہ کیا ہے ہماری رائے یہ ہے کہ نہ یہ حضرت لاابالی ہیں۔ نہ آوارہ گرد بلکہ سلیس اردو میں ان کے چال چلن کا ترجمہ یہ ہے کہ بدمعاش ہیں صاف اور کھلے ہوئے بدمعاش۔ شراب نہیں پیتے۔ جوا نہیں کھیلتے۔ چوک کی

کم خرچ بالانشیں جماعت سے بھی ایسی دلچسپی نہیں لیتے مگر ایک عیب یہ ہے کہ سینما روز دیکھتے ہیں۔ اور ہمیشہ دوسرے شو میں دیکھتے ہیں جو ساڑھے نو بجے شروع ہوکر بارہ بجے کے بعد ختم ہوتا ہے۔ ہاں تو یہ حضرت ہمارے دفتر اس وقت تشریف لائے جبکہ ہم گھر جانے کے لئے بالکل پابہ رکاب بیٹھے تھے۔ آپ نے آتے ہی فرمایا۔

"ختم کر چکے کام۔ چلو اب چلتے ہونا۔"

ہم نے کہا۔ "خیریت تو ہے۔ کہاں چلنا ہے؟"

بولے "گھر"۔

ہم نے کہا۔ "وہ تو میں سمجھا مگر کس کے گھر اپنے یا تمہارے۔"

کہنے لگے۔ "ایک ہی بات ہے۔"

ہم نے کہا۔ "بات تو ایک ہی ضرور ہے مگر گھر دو ہیں۔"

کہنے لگے "یار اٹھو بھی۔ ہمارے اور تمہارے درمیان اپنا پرایا کیا، بہرحال چلو یہاں سے۔"

شہاب نے ہم کو دفتر سے اٹھا کر اپنی موٹر سائیکل پر رکھا اور پھر موٹر سائیکل سے اٹھا کر اپنے گھر کی ایک آرام کرسی پر ڈال دیا۔ اور بڑی زور سے "یہاں آؤ" کہہ کر نوکر کو بلایا۔ اور چائے کا حکم دے کر آپ بھی ایک نصف آرام کرسی پر بیٹھ کر لگے اِدھر اُدھر کی ہانکنے۔ ہم نے حضرت کا یہ اطمینان دیکھ کر کہا:۔

"میرا ارادہ ہے کہ آج گھر بھی جاؤں گا۔"

شہاب نے سنجیدگی سے کہا:۔

”پہلے پیو چا۔ پھر دو ہاتھ ہوں ٹینس کے، اس کے بعد کھاؤ کھانا۔ اور پھر چلیں گے سینما جہاں آج کل اٹلانٹک ہو رہا ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”نہ بھیا بخشو مجھے، میں گھر کہہ کر نہیں آیا ہوں۔ وہاں طلیہ لکھوا دیا جائے گا مع انعام کے اعلان کے۔“

شہاب نے کہا۔ ”یعنی کیا مطلب تمھارا؟“

ہم نے کہا:۔

”مطلب یہ ہے کہ اس وقت سے لے کر اگر رات کو ایک بجے تک غائب رہا تو بیگم کا خدا جانے کیا حال ہوگا۔“

شہاب نے منہ چڑھا کر کہا۔ ”ہش ...... بڑی آئیں آپ کی بیگم۔ چلو کوٹ اتارو، منہ ہاتھ دھو ڈالو۔ یا غسل کرو گے؟“

ہم نے کہا۔ ”بھیا ہمارا کہنا مان لو ——“

شہاب نے ہم کو کرسی سے اٹھا کر کوٹ اتار لیا۔ اور بازو پکڑ کر غسلخانہ میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ لو میاں چپکے سے منہ دھو کر آدمی بن جاؤ۔“

مردہ بدست زندہ بن کر ہم کو منہ ہاتھ دھونا پڑا۔ چائے پینا پڑی۔ ٹینس کھیلنا پڑی۔ اور کھانا کھانا پڑا۔ اور ساڑھے نو بجے رات سے ساڑھے بارہ بجے رات تک سینما بھی دیکھنا پڑا۔ اس کے بعد شہاب نے اپنی موٹر سائکل پر بٹھا کر گھر تک پہنچا دیا۔ اور گھر پہنچا کر کہا ”کہو تو بھابی سے سفارش کر دوں کہ آج کچھ نہ بولیں؟“ ہم نے کہا:۔

”اچھا آپ تشریف لے جائیں۔ آپ کی اس سفارش کا شکریہ۔“

شہاب بھپٹ بھپٹ کرتے ہوئے تشریف لے گئے۔ اور اب ہم تھے اور اس بھیانک رات کی تاریکی میں اس کرفیو آرڈر کا خیال جس کی ہم نے صریحی خلاف ورزی کی تھی۔ غریب خانہ کا پھاٹک بند تھا اور ہونا بھی چاہیئے آدھی رات کو کسی مکان کا دروازہ کھلا ہوا نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ آج تو خاص طور پر دروازہ بند کرایا گیا ہوگا۔ تاکہ یہ خاکسار خوب اچھی طرح اپنی سزا کو پہنچے۔ بہرحال مرتا کیا نہ کرتا۔ اس خاکسار نے پھاٹک کو ادھر ادھر ایک آدھ جنبش دی۔ مگر یہ پھاٹک لکڑی کا ہونے کے باوجود کچھ ایسا مضبوط تھا۔ کہ مضبوطی میں آہنی پھاٹک اس سے سبق پڑھنے آیا کرتے تھے۔ یقین جانئے کہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ کوشش کی کہ اس کی دراز سے ہاتھ ڈال کر زنجیر کھول لیں مگر توبہ کیجئے صرف تین انگلیاں سما سکیں، اب ہم نے کوشش کی کہ اس پھاٹک پر چڑھ کر اندر پھاند جائیں۔ چنانچہ سنبھلتے ہوئے پھاٹک پر چڑھنے میں کامیاب ہوگئے۔ مگر وہاں ایک تازہ مصیبت یہ پیدا ہوئی کہ میاں ٹائیگر نے جو ہم کو اس طرح پھاٹک پر چڑھتے ہوئے دیکھا تو لگے نہایت بدتمیزی کے ساتھ "بف۔ غُر اور بھونکھ!" کرنے۔ اور ادھر ہم کو یہ ڈر معلوم ہوا کہ ان حضرت کے ان احتجاجی نعروں سے کہیں بیگم کی آنکھ نہ کھل جائے حالانکہ اسی احتیاط کی وجہ سے ہم نے ملازم کو آواز نہ دی تھی۔ بہرحال اس وقت ٹائیگر کو ڈانٹنے کا موقع نہ تھا۔ بلکہ خوشامد کی ضرورت تھی۔ لہٰذا ہم نے اوپر ہی سے چپکے چپکے کہنا شروع کیا "ٹائیگر۔ ٹائیگر ۔۔۔ کیا ہے بیٹا ۔۔۔ ارے ہم ہیں ہم شوکت تھانوی ۔۔۔ چپ رہو ۔۔۔ ٹائیگر ۔۔۔ ٹائیگر" ہماری یہ

ترکیب خاطر خواہ کامیاب ہو گئی۔ ٹائیگر نے آواز پہچان کر خاموشی کے ساتھ اپنی ناک کمر لچکا لچکا کر دم ہلانا شروع کر دی اس طرف سے اطمینان کر کے ہم پھاٹک سے اترنے لگے، ایک پیر ایک کیل پر رکھ کر جو زور دیتے ہیں تو اڑاڑا دھم دوسری طرف جا کر گرے۔ یقین جانئے کہ چوٹ کافی لگی تھی اور کپڑے بھی بفضلہ خوب خراب ہوئے تھے۔ مگر ایک تو گرنے کی آواز دوسرے ٹائیگر نے پھر بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ لہذا چوٹ کو بھول کر اس بدتمیز کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ چمکارا۔ خوشامد کی منت سماجت سے بمشکل تمام پھر وہ چپ ہو کر پیروں پر لوٹنے لگے۔ ہم بھی کپڑے جھاڑتے ہوئے دبے پاؤں آگے بڑھے، اب میدان صاف تھا صرف زینہ پر چڑھ کر کوٹھے پر جانا تھا اور اپنے بستر پر لیٹ رہنا تھا۔ مگر اب کمبخت جوتے کو چغلخوری کی شرارت سوجھی۔ خواہ مخواہ ہر قدم پر "چرمر" کرتا تھا خواہ کیسا ہی چپکے سے پیر کیوں نہ رکھا جائے مجبوراً ہم نے زینے پر بیٹھ کر جوتا کھول کر ہاتھ میں لے لیا اور خدا خدا کر کے کوٹھے پر پہنچ گئے، مگر اب مصیبت بالائے مصیبت یہ ملاحظہ فرمائیے کہ بیگم صاحبہ نے کمرہ اندر سے بند کر لیا تھا، کچھ ہم کو ستانے کے لئے اور کچھ تنہائی کی وجہ سے ڈر کے مارے۔ بہر حال ہمارے لئے تو مصیبت تھی ہی، ہم نے قریب جا کر دروازے کو کھولنا چاہا۔ اور اس کوشش میں معلوم یہ ہوا کہ دروازہ دراصل بند نہیں ہے بلکہ اندر سے محض بھیڑ کر دو اینٹوں سے اس کو روک دیا گیا ہے: تاکہ بلی کمرہ میں داخل ہو کر جانے کا دودھ نہ پی جائے۔ ہم

نے چپکے سے چھری ڈال کر اینٹوں کو کھسکانے کی کوشش شروع کر دی اور ہم خاطر خواہ کامیاب بھی ہو گئے۔ مگر ؎

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

ایک اینٹ کھسک کر کسی برتن پر کچھ اس طرح گری کہ ایک ڈھول تاشہ والی برات کا شور پیدا ہو گیا۔ اور ادھر ہم سمٹ کر دم بخود ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ اس لئے کہ یقین تھا کہ بیگم کی آنکھ ضرور کھل گئی ہوگی اور وہ تحقیقات ضرور کریں گی کہ بات کیا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ بیگم نے اٹھ کر بتی تیز کی اور بڑبڑاتی ہوئی دروازے کے پاس آئیں، لالٹین دروازے کے باہر نکال کر ادھر ادھر دیکھا۔ اور پھر یہ کہتی ہوئی کمرہ میں چلی گئیں کہ "یہ کم بخت ایسی لاگو ہو گئی ہے اور دودھ پی پی کر ایسی مٹائی ہے کہ اب بغیر بلی دان کے کام نہ چلے گا"۔ بہر حال وہ ہم کو نہ دیکھ سکیں اور پھر انہوں نے دروازہ بھیڑ کر دونوں اینٹیں نہایت مضبوطی کے ساتھ لگا دیں اس کے بعد وہ لیٹ کر سو رہیں، ادھر ہم نے پہلے تو ان کے سونے کا انتظار کیا اس کے بعد پھر نہایت احتیاط کے ساتھ چھری کی مدد سے اینٹیں ہٹا کر بخیریت تمام دروازہ کھول لیا۔ اور کمرہ کے اندر پہنچ کر دروازہ بند کرنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ گھڑی کی سوئی دو بجے سے ہٹا کر ساڑھے گیارہ بجے پر لگا دی، اس کے بعد کپڑے اتارے اور چپکے سے دبے پاؤں اپنی چارپائی پر پہنچے؛

چارپائی بولی "چرچوں" اور بیگم نے تکیہ سے سر اٹھا کر کہا:۔

"کون ہے؟"

ہم نے کہا۔ "ہم ہیں!"

بیگم نے پھر تکیہ پر سر رکھتے ہوئے کہا:۔

"کیوں آئے آپ، اب بھی نہ آتے!"

ہم نے کہا۔ کیا بتائیں، وہ مرے ہی نہایت بے وقت، میں تو ان کو مٹی دینے میں بالکل تھک کر چور ہوگیا ہوں۔ غریب کے گھر میں کہرام مچا ہوا ہے۔ اب کوئی آس نہ پاس!"

بیگم نے اپنا غصہ ختم کرکے پوچھا "کون مر گیا۔ یہ کس کا ذکر ہے؟"

ہم نے کہا: "وہ میرا اسکول کا ساتھی نظام الدین، ابھی بالکل جوان تھا۔ تین چھوٹے چھوٹے بچوں کا باپ ہیضہ میں آج صبح مبتلا ہوا اور دفتر میں مجھ کو خبر ملی کہ وہ چل بسا۔ فوراً اس کے یہاں گیا۔ تقریباً ۹ بجے جنازہ اٹھا!"

بیگم نے کہا "تو نو بجے سے اب تک وہیں رہے؟"

ہم نے کہا "نہیں تو۔ بس جنازہ کے ساتھ گیا۔ مٹی دی اور واپس آرہا ہوں۔ ابھی بجا ہی کیا ہے، کوئی بارہ کا عمل ہوگا۔" بیگم نے گھڑی دیکھ کر اطمینان کرتے ہوئے کہا۔ "اور کھانا؟"

ہم نے کہا۔ "نا صاحب، اب اس وقت کھانا نہ کھاؤں گا صبح دیکھا جائے گا۔ اب تو بس سو رہو۔"

بیگم نے ایک آدھ سوال مرحوم نظام الدین اور ان کے پس ماندگان کے متعلق کیا۔ اور پھر سو رہیں۔ ان کے سو جانے کے بعد ہم نے پھر گھڑی کی سوئی صحیح وقت پر لگا دی اور سو رہے۔ صبح یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہایت نہایت خطرناک طوفان آکر بخیریت تمام گذر گیا ہے۔ ۶

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

مگر یہ تو دیکھئے کہ وقت کس قدر ہوئی۔

مرحومہ

آمدم برسرِ مطلب سے قبل ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک بہت بڑی غلط فہمی کا امکان ختم کر دیا جائے، لہٰذا ناظرین نوٹ کر لیں کہ اس مضمون کی ہیروئن موجودہ شوکت دلہن نہیں بلکہ وہ مرحومہ ہیں جو عرصہ ہوا احسان کر گئیں۔ اور اپنے غریب شوہر کی انشا پردازی کا داغ لیے ہوئے حجلۂ عروسی سے گوشۂ قبر میں منتقل ہو گئیں۔ اِنّا للّٰہِ وَاِنّا اِلیہِ رَاجِعُون ط

خدا جنت نصیب کرے مرحومہ بڑی خوبیوں کی بی بی تھیں، شکل و صورت بھی بس یہ کہیے کہ غنیمت تھی۔ پڑھی لکھی بھی اتنا تھیں کہ راہِ نجات اور کریما میں سے دونوں یاد ہوں یا نہ یاد ہوں مگر یہ واقعہ ہے کہ پڑھی دونوں تھیں، پھر سب سے بڑی بات یہ کہ آدمی تھیں سمجھدار اور جانتی تھیں کہ زیادہ لکھنے پڑھنے سے آدمی کی صحت بھی خراب ہو جاتی ہے اور اس زمانہ میں لکھنا پڑھنا بیکار بھی ہے، یہی وجہ تھی ان کو خاص چڑھ اس بات سے تھی کہ یہ خاکسار دفتر میں دماغ کو چرخا بنانے کے بعد اپنے فرصت کے اوقات میں بھی کتاب کا کیڑا بنا رہے۔ یا لکھتا رہے۔ چنانچہ وہ اس کی خاص احتیاط ازراہِ شفقت زوجوی رکھتی تھیں کہ ایسا موقع بھی نہ آنے پائے، لہٰذا ہوتا یہ تھا کہ جہاں اس خاکسار نے کوئی کتاب اٹھائی یا قلم ہاتھ میں لیا وہ فوراً اپنے

پائینچے سنبھالتی ہوئی تشریف لے آئیں اور ہم نے جیسے ہی کچھ لکھنے کے لئے دماغ میں کوئی پلاٹ تیار کیا انہوں نے فوراً اپنے میکے کے واقعات۔ پڑوسن کے حالات، مغلانی کی داستانِ عشق وغیرہ شروع کر دی۔ اور ہمارا انشا پردازی کا ارادہ جس وقت تک ملتوی نہ کرا دیا سر پر سوار رہیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ رسائل کے ایڈیٹر صاحبان تقاضے کرنے کے بعد صبر کر چکے تھے۔ انشا پردازی کی تمام امنگیں گھٹ گھٹ کر مر چکی تھیں۔ قلم کا نب زنگ آلود ہو گیا تھا۔ دوات میں روشنائی خشک پڑی تھی۔ کاغذ کا سفید رنگ پڑے پڑے بادامی ہو گیا تھا۔ اور انشا پرداز کا دماغ رفتہ رفتہ مفلوج ہو رہا تھا۔ مگر وہ تو کہئے کہ فطرت کو بروقت رحم آ گیا۔ اور اس نے ہماری خطرہ میں پڑی ہوئی شوکت تھانوی کو مرحومہ کے وصل نہیں بلکہ وصال پر ملال سے بال بال بچا لیا ورنہ آج یہ مقالہ سپردِ قلم کرنے کے بجائے ہم کسی گراس فارم میں گھاس کھود رہے ہوتے۔

خدا جنت نصیب کرے، مرحومہ نے جب بہت ستایا تو ہم نے بھی چوری شروع کر دی۔ اور بجائے دن میں لکھنے کے اپنا دستور یہ کر لیا کہ جب رات کو تمام دنیا سوتی تھی، ہم لکھتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ رات کو دس ساڑھے دس بجے وہ سو گئیں اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ اب وہ واقعی سو گئی ہیں ہم چپکے سے اٹھے لالٹین کی بتی تیز کی اور لکھنے لگے۔ اگر مقدر سیدھا ہوا تو لکھ لیا کچھ۔ ورنہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ ہم اپنے خیال کی دنیا میں ہیں۔ قلم چل رہا ہے کاغذ سیاہ ہو رہا ہے۔ صفحۂ قرطاس پر انشا پرداز کے دماغ سے الفاظ کی شکل میں ادبی اور علمی نکات و رموز کی بارش ہو رہی ہے، آنکھیں کاغذ پر ہیں

اور دماغ میں عجیب منظر ہے کہ

"آفتاب کی تیز اور چمکدار شعاعیں بادل میں آکر نم ہو رہی ہیں۔
اور زمین پر وہ گرم اور روشن شعاعیں نہیں بلکہ بارش
کی ٹھنڈی اور لطیف بوندیں گر رہی ہیں " " " "

یکایک انھوں نے لحاف سے منہ نکال کر ہماری بے خبری اور محویت کے عالم میں کہا :-

"ارے کیا آپ لکھ رہے ہیں ؟"

ہم یکایک چونک پڑے اور اس جنبش سے کاغذ پر قلم نے ایک بے معنی لکیر کھینچ دی۔ ہم نے سنبھلتے ہوئے کہا :-

"ہاں ذرا لکھ رہا تھا میں"

انھوں نے کروٹ لیتے ہوئے کہا: "کیا بجا ہوگا"

ہم نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا: "ایک بجنے میں کوئی دس منٹ باقی ہیں"

انھوں نے محبت سے کہا :- "اچھا اب سو جائیے رات زیادہ آگئی ہے"

ہم نے کہا۔ "بہت ضروری چیز ہے، دفتر کا کام ہے۔ اگر نہ کیا تو گئی نوکری"

بیگم نے مجبور لہجہ میں فرمایا :-

"توبہ ہے اس نوکری سے، آدمی کاہے کو زندہ رہ سکتا ہے"

ہم نے کہا۔ "اچھا خیر اب سو جائیے آپ"

بیگم نے کہا: "میں تو سو ہی جاؤں گی۔ مگر ... ..."

ہم نے جھنجھلا کر کہا: "لاحول ولا قوۃ۔ آپ نے دماغ سے سب نکال دیا۔"

بیگم نے برا مان کر کہا: "واہ ... میں کچھ بولی بھی؟"

بیگم سوئیں تو نہیں، مگر احتجاجاً خاموش ہو گئیں۔ مگر اب جو ہم خیالات کو یک جا کرتے ہیں تو بجائے اُن خیالات کے ذہن میں صرف یہ آتا ہے۔

"اس بدمذاق عورت کو ذرا بھی احساس نہیں ... ... انشا پرداز کو شادی نہ کرنا چاہیے ... ... انشا پردازی اور بیوی دونوں آپس میں سوتیں ہیں ... ... کس وقت لکھا کریں ... ... یکسوئی اور بیوی دونوں میں سے صرف ایک بیک وقت حاصل ہو سکتی ہے ... ... ہم رات کو مردانہ مکان میں سویا کریں ... ... اس وقت کیا آمد تھی۔ اور دماغ کیسا کام دے رہا تھا ... ... اس عورت کو زیادہ تر میکے میں رکھا کریں ... ..."

ان خیالات کو ذہن سے نکالنے میں کچھ کم دیر نہیں لگی۔ بہ مشکل تمام دماغ کو زبردستی بدشوق لڑکے کی طرح لکھنے پر آمادہ کیا۔ اور "ولے براندش" سے کام لے کر لکھنا شروع کیا۔

"بارش کی چھما چھم میں باغوں کے جھولے اور جھولوں کے ساتھ اڑتے ہوئے ساریوں کے رنگین آنچل قوس قزح کی تمثیل پیش کر رہے ہیں اور فطرت کے چھیڑے ہوئے اس

ساز پر ترنم کی پوری دوشیزگی کے ساتھ ... رم جھم بدریا برسے ... کا نغمہ جسم میں جو کپکپی پیدا کئے ہوئے ہے شاید اسی کو وجد کہتے ہیں ....

کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس وقت بھی تم کو یاد نہ کروں، حالانکہ اس وقت خود کو بھول جانا کس قدر آسان ہے اسی قدر تمہاری یاد کو دل میں نہ آنے دینا دشوار ہے۔ تم یہ نہ سمجھو کہ یہ میری زیادتی ہے، میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اس وقت اگر تم میری جگہ ہوتے تو تم بھی میری ہی طرح ... ..."

انھوں نے پھر کہا۔ "آپ سوئے نہیں، کیا رات بھر لکھے ہی جائے گا۔"

ہم پھر دھک سے ہوگئے، اور چلتے ہوئے قلم نے یکایک رک کر کاغذ پر روشنائی کا ایک آنسو اس حادثہ کی یاد میں ٹپکا دیا۔ ہم نے کہا:۔

"بس اب سونے ہی والا ہوں۔"

"میری ہی طرح مجبور ہوتے اور آج بجائے میرے تمہارا قلم مجھ کو مخاطب کرکے یہ الفاظ ... ..."

بیگم نے کہا۔ "اب ذرا دیر سو بھی رہیے۔ سر میں درد ہونے لگے گا۔"

ہم نے کہا۔ "اَس ــــ تغ ــــ فراللہ۔ لیجیے میں نہیں لکھتا۔"

یہ کہہ کر قلم ایک طرف پھینک دیا۔ اور کاغذوں کا پیڈ دوسری طرف اچھال کر اپنی بوٹیاں اپنے دانتوں سے نوچتے ہوئے لحاف میں گھس گئے۔ اُدھر بیگم نے لوریاں دینی شروع کردیں۔

"آپ لکھیئے میں اب نہ بولوں گی۔ سر کے درد کا مرض ہے، ذرا سی شب بیداری میں درد ہونے لگتا ہے۔ اس لئے میں نے کہا تھا، میں تو کم بخت ذرا سی بات زبان سے نکال کر گناہگار ہو جایا کرتی ہوں، لاکھ لاکھ کہا کہ لکھنا ہے تو دن ہی کو لکھ لیا کیجئے مگر جب لکھیں گے رات کو لکھیں گے"

ہم نے لحاف کے اندر ہی سے کہا: "غلط کہتی ہو، جھوٹ بولتی ہو، دن کو کبھی تمھاری ہی وجہ سے نہیں لکھ سکتا، جب لکھنے کا ارادہ کیا تم سر پر سوار ہو جایا کرتی ہو۔ اب میں لکھنا ہی چھوڑ دوں گا۔ تاکہ یہ کوفت تو نہ ہو"

بیگم مسلسل تقریر فرما رہی تھیں: "میری وجہ سے ایسا ہی خلل ہوتا ہے تو میں کمرے کے باہر رہا کروں گی اور اب تو میں نے کان پکڑے کہ کبھی آپ کی ہمدردی میں بھی کوئی بات نہ کہا کروں گی۔ مہینہ بھر سے برابر چیخ رہی ہوں کہ حکیم صاحب کے یہاں جا کر سر کے درد کے لئے کوئی نسخہ لے آیئے مگر میری سنتا کون ہے۔ اب سے دور ماموں میاں کو بھی سر کے درد نے پریشان کر رکھا تھا، انھوں نے حکیم صاحب کا نسخہ کوئی ایک ہفتہ استعمال کیا ہوگا۔ بالکل اچھے ہو گئے۔ مگر یہاں تو مرض پالا جاتا ہے اور پھر یہ کہ رات رات بھر لکھا جائے گا اور صاحب بولو تو گناہگار۔ آنکھوں کا یہ حال ہے کہ روز بروز چشمہ کا شیشہ موٹا ہوتا جا رہا ہے۔ اور کیوں نہ ہو جب راتوں کو اس طرح جاگ کر لکھائی اور پڑھائی ہوگی تو آنکھوں

کی روشنی کہاں سے رہے گی، خدا نے دن کام کے لئے اور رات آرام کے لئے بنائی ہے مگر ان کا کارخانہ ہی الٹا ہے۔ مجھے ـــــ کبھی میں ـــــ نے دن کو ـــــ رات کو ـــــ دفتر ـــــ لکھنا ـــــ پڑھنا ـــــ توبہ ـــــ کان ـــــ ناک ـــــ انگلی ـــــ عینک ـــــ آنکھ ـــــ دماغ ـــــ سوئی ـــــ مگر ـــــ اگر ـــــ‘‘

صبح جو ہماری آنکھ کھلی تو دس بجنے میں چھ سات منٹ باقی تھے، خیریت یہ ہوئی کہ آج تعطیل کا دن تھا۔ ورنہ غیر حاضری گویا لطوبہ کمیشن ہوتی ہم کو بیدار دیکھ کر بیگم نے چائے لگا دی اور چائے سے فراغت کے بعد بولیں۔

’’اب آپ غصہ کو تھوک دیجئے اور پہلے تو حکیم صاحب کے پاس تشریف لے جائیے اس کے بعد آکر کھانا وانا کھا کے اطمینان سے رات تک لکھیے جتنا لکھا جائے سمجھے آپ‘‘

ہم نے ایک سعادتمند شوہر کی طرح لفظ بلفظ ان کے تمام احکام کی پابندی کی، حکیم صاحب کے یہاں بھی گئے اور واپسی پر کھانا بھی کھایا۔ اس کے بعد لکھنے بھی بیٹھے۔ بیگم نے حسب وعدہ کمرہ خالی کر دیا اور ہم کو مضمون نگاری کا پورا پورا موقع اس طرح دے دیا کہ اول تو خود ہٹ گئیں، دوسرے خاصدان میں بہت سے پان رکھ گئیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ حقہ کا بھی انتظام فرما دیا جس کے کشوں سے دھوئیں کی چادریں اوڑھ کر الہام خانۂ فطرت سے دماغ میں خیالات آتے ہیں۔ ہم نے اس رئیسانہ ٹھاٹھ

کے ساتھ حقہ کے کش لے لے کر پلاٹ سوچنا شروع کیا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں اپنے تخیلات کی دنیا میں گم ہو گئے، اور اسی عالمِ محویت میں قلم اٹھا کر کاغذ پر ۷۸۶ لکھنے کے بعد مضمون کا عنوان لکھا "طوفان" اس عنوان کے ماتحت ہم جو کچھ لکھنے والے تھے اس کے لئے خیالات کا ایک طوفان ہمارے دماغ میں لامحدود تخیل تھا۔ لہٰذا ہم نے لکھنا شروع کیا:-

"منجّم قیامت کی پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں۔ اور مرتے رہتے ہیں۔"

آواز آئی: "ذرا ایک منٹ کے لئے خلل انداز ہونا چاہتی ہوں!"

معلوم ہوا کہ ہم کو تخیلات کی دنیا سے اٹھا کر کسی نے اس بری طرح پھینکا ہے کہ ہم ابھی اپنے غریب خانہ میں اس کرسی پر آ کر گرے ہیں جس پر اس وقت تشریف فرما ہیں۔ غصہ تو سخت آیا۔ مگر جس بیوی نے خاصدان میں پان رکھے۔ حقہ بھر دیا۔ جو غریب خود رفیقۂ حیات ہونے کے باوجود آج بکمال ایثار ہم کو مضمون نگاری کے لئے تنہا چھوڑ گئی اس کی اس مداخلت بے جا کو انگیز کرنا ہی چاہیے تھا۔ لہٰذا ہم نے منافقانہ تبسم کے ساتھ کہا "کہیے کیا بات ہے؟"

بیگم نے نسخہ دکھاتے ہوئے کہا: "یہ دوائیں تو بھگوئی جائیں گی اور یہ بیج پیسے جائیں گے۔ ان دو دواؤں کی پوٹلی بنے گی۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ باقی دوائیں کیا ہوں گی۔ مثلاً یہ خرفہ کے بیج اور یہ آلو بخارے..."

ہم نے نسخہ ہاتھ میں لے کر دیکھا اور اس کی عبارت کو پہلے پڑھنے اور

بعد میں سمجھنے کی ناکام کوشش کے بعد اس طرح کہا کہ گویا سمجھ گئے۔ "یہ بیج پیسے جائیں گے۔ یہ شربت بھگویا جائے گا۔ یہ تمام دوائیں پوٹلی میں ڈال کر اچھال دی جائیں گی۔ اور اس عرق سے دوا کا پیالہ دھو کر صبح تازہ پانی سے اس پیالہ میں پلا دیا جائے گا۔"

بیگم نے غور سے سننے کے بعد کہا۔ "ہٹئے بھی سچ سچ بتائیے ہوگا کیا؟"

ہم نے نسخہ اچھالتے ہوئے کہا۔ "اسی بدتمیز حکیم سے پوچھو کہ کیا ہوگا میں کیا جانوں؟"

بیگم نے مایوس ہو کر کہا۔ "تو میں ماموں میاں سے پوچھ لوں؟"

ہم نے کہا۔ "ہاں ہاں۔ مجھے بخشو۔"

بیگم نے جانے کے بعد جو ہم نے اس جملہ پر غور کیا کہ "منجم قیامت کی پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں اور مرتے رہتے ہیں" تو یہ جملہ حکیم صاحب کے نسخہ سے کچھ کم پیچیدہ معمہ ثابت نہ ہوا۔ دل چاہا کہ اس جملہ کے آگے حکیم صاحب کا پورا نسخہ نقل کردیں۔ دماغ میں جو خیالات کا طوفان ابھی تھوڑی دیر پہلے تھا اس کا اب کوسوں پتہ نہ تھا۔ اور سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ ہم آخر لکھنے والے کیا تھے۔ تھوڑی دیر تک سر جھکائے ہوئے سوچتے رہے یہاں تک کہ سر میں درد شروع ہوگیا۔ اور مجبوراً اسی ایک جملہ پر مضمون کو ختم کرکے سر میں رومال باندھ کر پڑ رہے۔ لیجئے مضمون ختم۔

مگر خدا بہشت نصیب کرے، وہ حال اب کہاں۔ وہ خلوص ہمدردی وہ سر کے درد کا خیال اب کون کرے۔ موجودہ ہوم گورنمنٹ کا آئین جہانبانی

جداگانہ ہے۔ اب تو یہ ہوتا ہے کہ مضمون لکھو تو لکھنے کے کمرہ میں جا کر لکھو جہاں اگر اتفاقاً سے قلب کی حرکت بند ہونے لگے تو خلل کے خوف سے شربت کا ایک چمچہ بھی حلق میں ٹپکانے کوئی نہ آئے گا۔ اور اس دوران میں کیا مجال کہ پرندہ بھی پر مار جائے، بچوں کا شور و غل، گھر کی چہل پہل سب یک لخت گویا ہڑتال ہو جاتی ہیں۔ اور مضمون زبردستی لکھنا پڑتا ہے۔ خواہ "شعر گفتن" والا مضمون ہو یا "شعر زادن" والا مضمون۔ بیگم صاحبہ کو اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ سر میں درد اب کس حد تک ہے، مختصر یہ کہ رہ رہ کر مرحومہ یاد آتی ہیں خدا ان کو پہلو بہ پہلو جنت نصیب کرے۔

فلم فوجدار

شامت جو آئی تو مارے خلوص کے جناب میر صاحب کو سینما چلنے کی دعوت دے دی۔ ہمارے میر صاحب کو اس قسم کی دعوتیں قبول کرنے سے کبھی انکار نہیں ہوتا۔ اگر ان کا کوئی بے وقوف دوست ان کے لیے ٹکٹ خریدے اور سینما ہال میں ان کی بار بار لمنیڈ، سگار، پان وغیرہ سے تواضع کرتا رہے۔ چنانچہ اس دعوت کا بھی آپ نے خندہ پیشانی اور آمادگی کے ساتھ خیر مقدم کیا اور بولے:-

"کہاں چلو گے؟"

عرض کیا "سینما"۔

کہنے لگے۔ "وہ تو میں سمجھا مگر آخر کس سینما میں؟"

عرض کیا "یونیورسل پکچر پیلیس۔ وہاں آج کل مشہور فلم پورن بھگت ہو رہا ہے"

کہنے لگے "یہ تو کوئی ہندوستانی فلم معلوم ہوتا ہے"

عرض کیا "ہاں بظاہر تو ہندوستانی ہے۔ یوں عربی نکل جائے تو دوسری بات ہے"

ذرا ناک بھوں چڑھا کر بولے:-

"مجھ کو خدا معلوم کیوں ہندوستانی فلموں سے چڑھ ہے میں کبھی کوئی ہندوستانی فلم نہیں دیکھتا۔"

عرض کیا۔ "بات یہ ہے نا کہ وہ آپ کی زبان، آپ کی معاشرت، اور آپ کے ماحول سے قطعاً جداگانہ ہوتے ہیں۔ ان فلموں میں کتوں کے رونے کی طرح انگریزی گانے ہوتے ہیں، نہ ان ہندوستانی فلموں میں نٹ مارکہ ناچ ہوتا ہے۔ نہ پانیری زبان ہوتی ہے، آپ کو لطف آئے تو آخر کس بات میں؟ لیکن ہمارے یہاں تو غریبا سو ہی ہندوستانی فلم ہوتے ہیں اگر آپ تشریف لے چلنا چاہیں تو تشریف لے چلیں ورنہ مجبوری کا نام صبر ہے۔"

میر صاحب نے کہا:۔

"نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا میں تو کچھ ہندوستان کی صنعت فلم سازی سے مایوس سا ہوں۔ اس لئے میری دلچسپی اٹھ گئی ہے۔ بہرحال میں چلتا ہوں۔"

میر صاحب کے متعلق اور تو ہم کو سب کچھ معلوم تھا لیکن یہ ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ آپ کو صنعت فلم سازی میں بھی دخل ہے۔ اگر ہم یہ جانتے تو قسم لے لیجئے کہ کبھی ان حضرت سے سینما چلنے کو نہ کہتے۔ اس لئے کہ یہ ہماری ہمیشہ سے چڑھ ہے کہ کسی فلمی خدائی فوجدار کے ساتھ سینما جائیں اور وہاں بجائے تفریح کے خواہ مخواہ کا دردسر مول لیں اور اپنا دماغ چٹوائیں۔ میر صاحب کی اس گفتگو سے قبل ہم کو ان کے متعلق یہ شبہ بھی

نہ تھا۔ مگر اس گفتگو کے بعد ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، کہ خدا ہی خیر کرے یہ حضرت بھی فلمی لقمان معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اب چارہ کار ہی کیا تھا۔ دعوت دے چکے تھے، اور وہ دعوت قبول فرما چکے تھے۔ لہٰذا مرتا کیا نہ کرتا۔ گئے ان کو ساتھ لے کر سینما میں۔

سینما ہال میں جیسے ہی یکایک تاریکی پیدا ہوئی۔ اور پردہ سیمیں پر روشن حروف تھرتھرائے ہم اپنا چشمہ صاف کر کے اور ٹوپی اتار کر گویا ہاتھ دھو کر فلم دیکھنے کے لئے بیٹھ گئے، اور ذرا آرام لینے کے لئے اپنے نزدیک صوفے پر پھیل کر بیٹھ گئے، مگر عین اسی وقت میر صاحب نے ہمارا بازو پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا:۔

”دیکھو اس بیک گراؤنڈ پر جو ساز بج رہا ہے وہ قطعاً بے محل ہے اس موقع پر نہایت ہلکے سُروں میں پیانو بجانا چاہیئے تھا“

ہم ”ہوں ہاں“ کہہ کر پھر بجنسہ اطمینان سے بیٹھ گئے۔ اور ڈرامہ شروع ہو گیا۔ ابھی مشکل سے دو تین مناظر ہم نے دیکھے ہوں گے کہ میر صاحب ایک دم سے ہم پر لد پڑے اور کان کے قریب منہ لا کر بولے:۔

دیکھو راجہ کے یہاں ولادت کا منظر کس قدر غلط دکھایا گیا ہے اول تو اس موقع پر راجہ کی پریشانی ہی غلط ہے، دوسرے پریشانی کے جو آثار راجہ کے چہرے پر دکھائے گئے ہیں۔ وہ بالکل مہمل ہیں۔ ان بدتمیز ہندوستانی اداکاروں کو کبھی فن تمثیل نہیں آسکتا۔ اس موقع پر اگر کوئی ہالی وڈ کا آرٹسٹ ہوتا تو آپ خود کہتے کہ ہاں اس کو پریشانی کہتے ہیں۔

اتنی دیر میں خدا جانے کتنے مناظر غائب ہو چکے تھے۔ آنکھوں سے ہم سب کچھ دیکھ رہے تھے مگر نہ سننے کے لئے کان ساتھ دے رہے تھے نہ سمجھنے کے لئے دماغ اور اس وقت ہم کو اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا کہ ان حضرت کو ساتھ لے کر کیوں آئے ہیں۔ ہم نے بجائے کوئی جواب دینے کے نہایت عاجزی کے ساتھ کہا:۔

"بھائی یہ خامیاں تو ہیں ہی مگر کیا کیا جائے، بہرحال اب تو آ گئے ہو، لہٰذا دیکھ لو جو کچھ اس فلم میں ہے پھر اطمینان سے گفتگو کریں گے۔"

میر صاحب نے کہا۔ "اماں تمہیں خدا کی قسم ذرا دیکھو تو سہی کہ اس لغویت کو کیونکر ٹھنڈے دل سے دیکھا جا سکتا ہے کہ سادھو صاحب تشریف لائے اور راجہ کے محل سے شاہزادے کو پیدا ہوتے ہی لے گئے استغفر اللہ گویا دکھایا یہ گیا ہے کہ ہندوستان اس حد تک توہم پرست ہے، یہ تو ہندوستان کو بدنام کرنا ہوا۔ اگر ممالک غیر میں یہ فلم دکھائے جائیں تو کس قدر مضحکہ ہو۔"

ہم نے جل کر کہا۔ "آپ کی اور ہماری بلا سے مضحکہ ہوگا۔ آپ اس فلم کو بہرحال دیکھئے۔"

میر صاحب نے ہنس کر کہا:۔

ہاں بھائی دیکھ رہے ہیں جو کچھ خدا دکھا رہا ہے ــــــ لاحول ولا قوۃ۔"

باوجود اس کے کہ فلم کا بیشتر حصہ میر صاحب کے سفر نے ہمارے

دماغ سے کاٹ دیا تھا۔ مگر ہم کو اس کا اندازہ ہو رہا تھا کہ واقعی یہ فلم ہندوستانی فلموں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور اگر اسی معیار پر ہندوستانی فلم بننے لگیں تو ہندوستان میں بھی فلم سازی سے وہ ٹھوس خدمات لی جاسکتی ہیں جو دوسرے ممالک میں لی جاتی ہیں، بہر حال میر صاحب کی عنایت سے جو لمحات سکون ہم کو اس وقت مل رہے تھے ان کو نہایت ہی قیمتی سمجھ کر نہایت توجہ کے ساتھ اس فلم کو دیکھ رہے تھے، مگر توبہ کیجئے میر صاحب بھلا ماننے والے تھے۔ وہ اپنے کو صنعت فلم سازی کا بہترین ماہر بھی سمجھتے تھے اور اپنی رائے کو اس فن کے سلسلہ میں سند جانتے تھے۔ ہم کو یہ تو معلوم تھا کہ یہ مالیخولیا ہندوستان کے فلمی ناظرین میں عام طور پر پھیلا ہوا ہے، مگر میر صاحب کے متعلق ہم کو یہ تلخ تجربہ آج ہی ہو رہا تھا، بار بار وہ ہم کو نوچ کھسوٹ رہے تھے۔ اور بار بار ہمارے کان میں منہ لگا کر اس طرح باتیں کرتے تھے کہ اس وقت ہم نہایت خلوص دل کے ساتھ ان کے لئے اس قسم کی دعاؤں میں مصروف تھے کہ خدا کرے یہ تھوڑی دیر کے لئے گونگے ہی ہو جائیں یا خدا کرے یہ بیہوش ہو جائیں اور فلم کے ختم ہونے تک ان کو ہوش نہ آئے، یا ان کا دماغ کچھ اس طرح چکرائے کہ یہ ہوا کھانے کے لئے باہر چلے جائیں مگر ہماری ہر دعا بے اثر تھی اور میر صاحب کی تکلیف دہ نقادانہ حرکتیں مسلسل جاری تھیں۔ ہمارا شانہ پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولے۔

"اسی قسم کا ایک فلم کسی امریکن فلم کمپنی کا بنایا ہوا میں تین یا چار

سال ہوئے دیکھ چکا ہوں، اس کا بھلا سا نام تھا، تم بھی دیکھ چکے ہو گے کہ اس میں ایک ڈیوک کے لڑکے کو فادر لے جاتے ہیں اور کلیسا میں اس وقت تک رکھتے ہیں جب تک کہ وہ بالغ نہیں ہو جاتا ـــــ کیا نام ہے اس کا کچھ تمھیں یاد ہے؟"

ہم نے جھنجھلا کر کہا "نانسنس"۔

کہنے لگے "نہیں جی نانسنس نہیں کچھ اور نام ہے، دماغ میں ہے زبان پر نہیں آتا۔ ٹھیک ہے "چرچ بوائے" اس کا نام ہے، اللہ اکبر! کیا قیامت کا فلم بنایا ہے ظالموں نے کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ وہ کیا بلا ہے یعنی حد ہے کہ ـــــ"

جس وقت میر صاحب نے گفتگو شروع کی ہے، پورن ایک شہزادی کے یہاں دان لینے گیا تھا وہاں نہایت دلچسپ گفتگو ہوئی، مکالمہ بھی اچھا تھا اور تمام پلاٹ کا نچوڑ اسی منظر میں تھا مگر میر صاحب کی اس بکواس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ منظر مع دو تین اور مناظر کے کچھ اس طرح مہمل ہو کر رہ گیا کہ اب جو دیکھتے ہیں تو جناب پورن سادھو کی کٹی کے پاس ہاتھ جوڑے بیٹھے ہیں اور سادھو صاحب بھجن گانے میں مصروف ہیں، کچھ سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ واقعہ کیا ہے، اور یہ حضرت کہاں گئے تھے کیوں گئے تھے۔ اور کیونکر واپس آکر کیا پیام لائے، اور اب یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم نے غصہ میں کمال کا ضبط پیدا کر کے میر صاحب سے کہا:۔

"بھائی اس طرح تو تمام فلم نہ تم دیکھ سکو گے نہ ہیں ـــــ"

میر صاحب نے ہنس کر ارشاد فرمایا۔ "اس میں کونسی چیز دیکھنے کی ہے، خواہ مخواہ اپنا ذوق خراب کرنے سے کیا فائدہ!"

ہم نے مارے غصہ کے فلم کی طرف سے ان کی طرف گھوم کر کہا۔ "آخر یہ تمام باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں ان کی اسی وقت کیا ضرورت ہے؟"

میر صاحب نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اور میں یہ کہتا ہوں کہ آخر اس فلم کو دیکھنے سے کیا حاصل!"

ہم میں اب ضبط کا یارا نہ تھا، غصہ میں کہا: "کچھ حاصل نہیں؟"

میر صاحب نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "کچھ حاصل نہیں۔"

ایک اور صاحب نے میر صاحب کو ٹھوکا دے کر کہا، "بھائی صاحب چپکے چپکے بولئے، آپ تو سننے ہی نہیں دیتے!"

میر صاحب نے ان کو تو کوئی جواب نہ دیا، مگر ہم سے بولے، "آپ بھی آپ کی طرح ہمہ تن اس لغویت میں مستغرق ہیں۔"

ہم اس وقت احتجاجاً پردۂ سیمیں کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے اور گویا یہ طے کر کے بیٹھے تھے اب اسی کم بخت میر صاحب کی بکواس سنیں گے اس لئے کہ ٹکٹوں کے دام تو بہرحال ٹھک ہی گئے تھے، تماشہ کو بیچ بیچ میں سے دیکھنے سے واقعی اب کچھ حاصل نہ تھا۔ لہٰذا ہم نے میر صاحب سے کہا:-

"ہاں اب فرمایئے آپ کیا کہتے ہیں؟"

میر صاحب نے کہا:-

تم کو اس طرح برا معلوم ہو رہا ہے گویا یہ فلم تمھارا ہی بنایا ہوا ہے

بھائی میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہندوستانیوں کو کبھی فلم بنانا نہ آئے گا۔"

ہم نے جل کر کہا۔ "اور میں کہتا ہوں کہ ہندوستانیوں کو کبھی فلم دیکھنا نہ آئے گا۔"

میر صاحب نے کہا "یعنی"۔

ہم نے عرض کیا۔ "یعنی یہ کہ تنقید کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے خاموشی سے اس چیز کو بہ نظر غائر دیکھ لیا جائے جس پر تنقید کرنا ہو اس کے بعد تنقید کا سلسلہ شروع کیا جائے مگر آپ ہیں کہ آپ کی تنقید کا جوش ابلا ہی پڑتا ہے۔ دیکھنے بھالنے کچھ نہیں بس ہاتھ دھو کر تنقید کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔"

میر صاحب بولے۔

"سرکار خطا معاف، اس قاعدہ کی پابندی ان مواقع پر ضروری ہوتی ہے جبکہ کسی سنجیدہ چیز پر تنقید مقصود ہو اور بال کی کھال نکالنا ہو یہاں تو پیش پا افتادہ خامیاں۔ غلطیاں بلکہ غلطیوں اور بدتمیزیوں کے قدم قدم پر ایسے ڈھیر ہیں کہ کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں جس قسم کی تنقید آپ کہتے ہیں وہ انگریزی فلموں پر ہو سکتی ہے۔ ان فلموں پر نہیں جو کہ تانگے والوں اور گنڈیریاں پاپڑ بیچنے والوں کے لئے بنائے جاتے ہیں۔"

انٹرول ہو چکا

تماشہ پھر شروع ہوگیا ——— گانا ہو رہا ہے۔ مکالمہ ہو رہا ہے۔

مگر ہم نے کہا "اس کے ذمہ دار آپ ہیں۔ یا ہندوستانی فلم ساز؟"

میر صاحب نے کہا: "ہم یعنی ہم ہیں؟"

ہم نے غصہ میں کہا: "جی ہاں آپ اور آپ کی طرح کے دوسرے فلمی خدائی فوجدار۔ آپ لوگ خود کبھی ہندوستانی صنعت فلم سازی کی ترقیوں میں کوشاں نہیں ہوتے۔ آپ لوگوں نے دیسی فلموں کی طرف سے لاپروائی برتی اور آپ لوگوں نے اپنی تمام توجہ کا مرکز انگریزی فلموں کو رکھا۔"

میر صاحب نے کہا۔ "آپ کا اس سے مطلب؟"

ہم نے کہا "اس سے مطلب یہ کہ اگر آپ نے ہندوستانی فلموں سے دلچسپی لی ہوتی اور انگریزی فلموں کو انگریزوں کے لئے چھوڑ کر اگر آپ ان معیار سے گرے ہوئے ہندوستانی فلموں پر نظر عنایت فرماتے تو ان ہی فلموں کو آپ اپنے معیار کے مطابق بنا سکتے تھے۔"

میر صاحب نے کہا۔ "وہ آخر کیونکر؟"

ہم نے کہا "سنے جائیے، آج آپ نے سینما ہال کو اگر دارالمباحثہ بنایا ہے تو سنیئے اطمینان سے بیٹھ کر ——— فلم کمپنیوں کے مالکوں کو اردو اخبارات کے مالکوں اور ایڈیٹروں کی طرح معلوم ہے کہ جس طرح ہندوستان کے تھوڑی سی انگریزی پڑھے ہوئے کالے آدمی پانیر اور سول ملٹری گزٹ

کے مقابلے میں اردو اخبارات کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیتے ہیں اسی طرح انگریزی داں ہندوستانی ہمیشہ انگریزی فلم دیکھتے ہیں اور ہندوستانی فلم دیکھنے کے لئے وہ لوگ رہ جاتے ہیں جن کو آپ یکہ اور تانگے والے کہتے ہیں ۔ فلم کمپنیوں کے ناظرین یہی چوّنی والے ہیں اور فلم کمپنیاں مجبور ہیں کہ وہ ان ہی کے ذوق کے مطابق فلم بنائیں۔”

میر صاحب نے تالی بجا کر کہا: ”خیر خیر۔ آپ نے مانا تو سہی کہ ہندوستانی فلم چوّنی والوں کے لئے ہوتے ہیں۔”

ہم نے کہا: - میں نے تو مان لیا ۔ مگر آپ کو اپنی شرافت کی قسم ہے کہ آپ ہرگز یہ نہ مانئے گا کہ اس کی وجہ کیا ہے یعنی میں کہہ رہا ہوں کہ آپ ہی کی قسم کے لوگوں نے ہندوستانی فلم سازوں کو اس بات کے لئے مجبور کر دیا ہے کہ وہ دانستہ گرے ہوئے معیار اور بازاری مذاق کے فلم بنائیں۔ ورنہ یہ بہت آسان ہے کہ فلم کمپنیاں بلند معیار کے فلم بنانا شروع کر دیں مگر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ تو انگریزی فلموں کے عشق میں ہندوستانی سینما ہالوں کا رخ بھی نہیں کرتے، رہ گئے چونی والے وہ بھی اپنی سمجھ سے بالاتر اور اپنے مذاق کے اعتبار سے خشک فلم دیکھ کر گھروں میں بیٹھ رہیں اور بیچارے ہندوستانی فلم ساز گویا آپ کے اقبال سے بس ڈنڈے بجاتے رہ جائیں۔ یہی ہے نا آپ کا مطلب؟”

اب میر صاحب ذرا خاموش رہے مگر چونکہ اعتراف کرنا اور قائل ہونا ان کی وضع اور غالباً خاندانی روایات کے خلاف تھا لہذا کچھ دیر

بغلیں جھانک کر بولے:۔

ہم تو اس لئے توجہ نہیں کرتے کہ فلم ہمارے مذاق کے نہیں ہوتے اگر وہ ہمارے مذاق کے فلم بنائیں تو بے شک ہم اس طرف متوجہ ہوں گے۔"

ہم نے کہا:۔

مگر بھائی صاحب اس کی صورت یہ ترک موالات نہیں ہے جو آپ حضرات اختیار کئے ہوئے ہیں۔ بلکہ طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ آپ ہندوستانی فلم دیکھئے اور ان پر برابر اظہار خیال کرتے رہیئے جو فلم اس قابل ہو کہ اس کی حوصلہ افزائی کی جائے اس میں قطعاً بخل اور تعصب سے کام نہ لیجئے۔ مثلاً یہ فلم جو آپ دیکھ رہے ہیں یقیناً یہ فلم ہندوستانی فضاؤں کو دیکھتے ہوئے بہترین ہے مگر اس پر حوصلہ شکن تنقیدیں گویا تحریک ہوں گی اس بات کی کہ ہندوستانی صنعت فلم سازی کو اس حد تک لانا یا اس سے آگے بڑھانا فلم سازوں کی غلطی ہے۔ ان کو چاہیئے کہ وہ اپنی مقررہ پستی میں رہیں اور اگر آپ نے اس کی حوصلہ افزائی کی تو وہ خود آپ کا مذاق سمجھ کر اس معیار سے آگے بڑھیں گے"!

میر صاحب کچھ اور کہنا ہی چاہتے تھے کہ سینما ہال روشنی سے جگمگا اٹھا اور لوگ یکایک باہر نکلنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ہم بھی لاحول پڑھتے ہوئے اٹھے اور راستہ بھر میر صاحب پر اپنے ٹکٹوں کے دام ضائع ہونے کا غصہ اتارتے ہوئے گھر چلے گئے۔ دوسرے دن ہم نے تنہا آکر اس فلم کو دیکھا اور ہمیشہ کے لئے قسم کھالی کہ اب کبھی میر صاحب کو تو خیر لائیں گے ہی نہیں مگر میر صاحب کے علاوہ بھی کسی نئے آدمی کو ساتھ لانا خطرناک ہے کہ خدا جانے کیسا نکل جائے۔

موازنہ لکھنؤ و لاہور

ایک تھانوی کے لئے لکھنؤ و لاہور دونوں برابر ہیں، نہ وہ لاہور پر لکھنؤ کو غالب دیکھ کر فخر کر سکتا ہے، اور نہ لکھنؤ کو لاہور سے گرا ہوا دیکھ کر اس کو افسوس ہوگا۔ البتہ اگر تھانہ بھون ضلع مظفرنگر کا ان دونوں میں سے کسی کا مقابلہ ہو جائے تو "حب الوطن من الایمان" کا تقاضا تو یہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے تھانہ بھون کو سب سے بڑھ چڑھ کر ثابت کر دے۔ اور خواہ تھانہ بھون اس مقابلے میں "چاروں خانے" چت کرے مگر وہ یہی نعرہ بلند کرے گا کہ "وہ مارا" بہرحال لکھنؤ اور لاہور کے مقابلے میں تھانہ بھون سے کوئی بحث نہیں۔ اور نہ ایک تھانوی اس مقابلے میں کسی طرف سے جانبداری کر سکتا ہے۔ مگر خدا جانے کیوں برادر محترم ڈاکٹر محمد عمر صاحب کے ذہن میں یہ جم گیا تھا کہ میں لکھنؤ کے طرفداروں میں ہوں۔ اور صرف لکھنؤ کا طرفدار ہی نہیں ہوں بلکہ لاہور سے مجھ کو للّٰہی بغض بھی ہے۔ حالانکہ میرے فرشتوں نے بھی ۱۰ جولائی سنہ ۱۹۳۲ء سے پہلے کبھی لاہور خواب تک میں نہ دیکھا تھا۔ پھر لاہور کا لکھنؤ سے مقابلہ کیا کرتا اور لاہور سے مجھ کو بغض ہوتا تو کیوں؟ مگر کسی کے خیال پر ہمارا کیا قابو ہو سکتا ہے؟ ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں یہ خیال تھا اور ہم اس خیال کو ان کے ذہن سے نکالنے میں باوجود ہزار کوششوں کے ناکام تھے۔

بات اصل میں یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب ان دونوں شہروں کو ایک دوسرے

سے ٹکرا کر لاہور کی فتح کا ہم سے اعتراف کرانا چاہتے تھے۔ اور ہم اس کو ان کی زبردستی سمجھتے تھے، وہ چاہتے تھے، کہ ہم بغیر آنکھوں سے دیکھے بس کانوں سے سن کر لاہور کی افضلیت پر ایمان لے آئیں، اور ہم اس نادیدہ عشق کے اصولاً قائل نہ تھے۔ لہذا طے پایا کہ محض اسی لکھنؤ اور لاہور کی کشتی کے لئے ہم لاہور کا سفر کریں اور لاہور کی زیارت کرنے کے بعد لکھنؤ اور لاہور کے مقابلہ کا ایماندارانہ فیصلہ قلمبند کریں۔ تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

لاہور کو سرسری طور پر گھوم پھر کر دیکھنے کے بعد جب ہم نے لکھنؤ اور لاہور کو ایک ہی میزان پر رکھ کر وزن کرنا چاہا تو ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ لکھنؤ موجودہ حالت میں اجڑے ہوئے دیار کے نام سے پکارا جا سکتا ہے اور لاہور کی ترقیاں شباب پر ہیں۔ لکھنؤ کی بہاریں لٹ چکی ہیں۔ اور لاہور میں اب بہار آئی ہے۔ لکھنؤ کے کھانے کھیلنے کے دن گزر گئے، لیکن لاہور کے دودھ کے دانت بھی ابھی نہیں ٹوٹے۔ لکھنؤ ایک تنزل پذیر شہر ہے۔ اور لاہور ترقی پر ہے لیکن باوجود ان تمام باتوں کے ان دونوں شہروں کی کچھ علیحدہ علیحدہ خصوصیتیں ہیں۔ جو اس مقابلے کو بہرحال برابر کی ٹکر کا بنائے دیتی ہیں۔

اگر کبھی پرکھی بٹھائی جائے تو ہم کو لکھنؤ میں شالامار باغ کا جواب ڈھونڈنا پڑے گا۔ اور لاہور میں رومی دروازہ کا۔ لیکن یہ ترکی بہ ترکی مقابلہ تو اسی وقت ہو سکتا تھا کہ کوئی سخی داتا ان دونوں شہروں کو ایک ہی نقشہ پر آباد کرتا۔ اور پھر دیکھتا کہ ان دو یکساں شہروں میں ایک دوسرے پر کس کو امتیاز حاصل ہے۔ کس میں شالامار زیادہ خوبصورت بنا ہے۔ اور کس میں آصف الدولہ کا امام باڑہ زیادہ خوبصورت

نظر آتا ہے۔ مگر جب یہ دونوں شہر شکل و صورت میں ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں تو ظاہر ہے کہ دونوں میں سے اگر کسی کی ناک اچھی ہوگی تو کسی کی آنکھ اور دونوں میں سے اگر کسی کی ٹانگ میں کوئی عیب ہوگا تو کسی کے ہاتھ میں اور ممکن ہے کہ باوجود یکسر اختلاف کے دونوں صورتیں اپنی اپنی جگہ پر اچھی ہوں یا دونوں کو دیکھ کر طبیعت مالش کرنے لگے۔

لاہور اور لکھنو کا مقابلہ اگر تفصیل کے ساتھ کیا گیا تو یہ سمجھ لیجئے کہ یہ مضمون لاہور اور لکھنؤ کے مجموعی رقبہ کے برابر طویل ہو جائے گا۔ لہٰذا بہترین صورت یہی ہے کہ ہم وہی مقابلہ کریں جس کو آج کل کے مترجم انگریزی میں "طائرانہ نظر" والا مقابلہ کہتے ہیں۔ لہٰذا ہم کو طائرانہ نظر سے مقابلہ کرنے کے لئے پہلے عمارتوں پر منڈلانا چاہیئے۔ اس کے بعد شہر کے گلی کوچوں پر اڑنا چاہیئے۔ پھر گھروں کی حالت دیکھنا چاہیئے، پھر دونوں شہروں کے باشندوں کی ترکیب نحوی کرنا چاہیئے، اور آخر میں دونوں کی عام حالت لکھ کر یہ کہہ دینا چاہیئے کہ یہ بھی جیتے اور وہ بھی جیتے۔ جیسے ان دونوں کے دن پھرے۔ خدا سب کے پھیرے۔

لاہور کی عمارتوں میں سب سے پہلے ہم نے شاہی مسجد دیکھی، واضح رہے کہ یہاں مقابلہ دہلی اور آگرہ کا نہیں بلکہ لکھنؤ اور صرف لکھنؤ سے ہے، یہ شاہی مسجد شہنشاہ محی الدین عالمگیر کی زندہ یادگار ہے۔ لکھنؤ میں بھی شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلہ کی مسجد کو لوگ کہتے ہیں کہ عالمگیر نے بنوائی تھی۔ بہرحال جب ہم نے لاہور کی شاہی مسجد دیکھی تو ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ لکھنؤ کی ٹیلے والی مسجد دونوں ایک ہی عالمگیر کی بنوائی ہوئی نہیں ہو سکتیں۔ اور اگر یہ دونوں مسجدیں واقعی عالمگیر

ہی نے بنوائی ہیں نوان میں بھی اللہ میاں کے دولت خانہ اور اللہ میاں کے غریب خانہ کا فرق رکھا ہے۔ لاہور کی عظیم الشان شاہی مسجد کو ٹیلہ والی مسجد سے کوئی نسبت ہی نہیں، البتہ خوبصورتی میں سرائے معالی خاں لکھنؤ کی جامع مسجد کو شاہی مسجد کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن شاہی مسجد کی اس صنعت کا کوئی جواب نہیں کہ اس کے ہر مینار سے مقبرۂ جہانگیر کے صرف تین مینار نظر آتے ہیں اور مقبرۂ جہانگیر کے ہر مینار سے اس شاہی مسجد کے صرف تین مینار نظر آتے ہیں۔ اور دونوں عمارتوں کا چوتھا مینار مغل انجینری کے کمالات میں گم ہو جاتا ہے۔

شاہی مسجد کے بعد داتا گنج بخش کی درگاہ کی زیارت کی، اس کے مقابلہ کے لئے لکھنؤ میں شاہ مینا صاحب کی درگاہ موجود ہے، ہماری رائے ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے ذاتی موازنہ سے زیادہ بہتر ہوگا کہ صرف درگاہوں کا مقابلہ کیا جائے۔ درگاہوں کے مقابلے میں شاہ مینا صاحب کی درگاہ کو ہر حیثیت سے داتا گنج بخش کی درگاہ پر افضلیت حاصل ہے۔ مقام وقوع کی موزونیت۔ عمارت کی عمدگی۔ درگاہ کا انتظام، مختصر یہ کہ ہر بات میں ہم نے شاہ مینا صاحب کی درگاہ کو بہتر پایا۔

مقبرۂ جہانگیر کا جواب لکھنؤ میں آصف الدولہ کا امام باڑہ ہے۔ اور دونوں عمارتیں اپنی اپنی جگہ پر ایک دوسرے سے بہتر ہیں البتہ لکھنؤ کی کسی عمارت میں یہ حادثہ کبھی نہیں ہوا کہ عمارت کا کوئی حصہ اٹھا کر کسی دوسری عمارت میں پہنچا دیا جائے لیکن مقبرۂ جہانگیر کے اوپر سے ایک مسلّم بارہ دری اٹھا کر

شاہی مسجد کے سامنے لے جا کر رکھ دی گئی ہے۔ وہ جس طرح شاہی مسجد کے سامنے رکھی ہوئی ہے اُسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو اکھاڑ کر لایا گیا ہے۔ اور مقبرۂ جہانگیر کی چھت پر اس کے جو نشان ہیں وہ اس بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔ بہرحال جہانگیر کے مقبرہ میں اگر عہد مغلیہ کے کمالاتِ فنِ تعمیر کے نمونے نظر آتے ہیں تو آصف الدولہ کے امام باڑہ میں بھی شاہانِ اودھ کے زمانے کی انجینیری کا عروج نظر آتا ہے۔ لاہور بجا طور پر مقبرۂ جہانگیر پر فخر کر سکتا ہے لیکن آصف الدولہ کے امام باڑہ پر لکھنؤ کا فخر بھی بیجا نہ ہوگا۔

مقبرۂ جہانگیر کے بعد ہیں نے جہانگیر کی چہیتی ملکہ نور جہاں کی ویران قبر بھی دیکھی لکھنؤ میں اس قدر پر تاثیر اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی کوئی یادگار نہیں ہے۔ نور جہاں کی قبر پر یہ لکھا ہوا نہیں ہے۔ لیکن وہاں کی خاموش فضا میں اب تک یہ شعر پڑھ رہی ہیں۔

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

لکھنؤ اس قسم کا عبرت انگیز مقام پیش کرنے سے قاصر ہے۔

لاہور کی ان تاریخی عمارتوں کے علاوہ قلعہ کو چھوڑ کر اگر وہاں کوئی اور تاریخی عمارت ہے تو وہ ہم نے نہیں دیکھی۔ البتہ شالامار باغ دیکھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ لوگ کشمیر کو جنت نظیر کہتے ہیں، مگر ہم کو تو شالامار باغ ہی پر باغ رضوان کا شبہ ہو رہا تھا۔ لکھنؤ تو لکھنؤ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اس کا جواب دور دور نہ ہوگا اس سے بہتر مناظر ہو سکتے، اس سے قیمتی یادگاریں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن جو شعریت

قدرتی طور پر اس میں پیدا ہو گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہی ہے۔

اب ذرا بازاروں کی سیر کیجئے، سب سے پہلے انارکلی بازار ہے۔ جس کے مقابلہ پر لکھنؤ میں امین آباد پارک مع بازار کے پیش کیا جائے گا۔ انارکلی کو واقعی لاہور میں وہی حیثیت حاصل ہے جو لکھنؤ میں امین آباد پارک کو اور لکھنؤ میں امین آباد پارک کو وہی حیثیت حاصل ہے جو لاہور میں انارکلی بازار کو۔ انارکلی بازار میں بڑی بڑی دوکانیں ہیں اور ہر وقت شانہ سے شانہ چھلنے والی چہل پہل رہتی ہے۔ اس بازار میں نہ صرف پنجاب کے شلواری بادبان اڑاتے ہوئے باشندے نظر آتے ہیں۔ بلکہ بھانت بھانت کے انسان اپنی اپنی بولی بولتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لاہور اس بازار پر بجا طور سے فخر کر سکتا ہے۔ مگر امین آباد پارک کے بازار کو جس خوش سلیقگی اور ترتیب کے ساتھ آباد کیا گیا ہے اس کا جواب انارکلی کا یہ بازار اعظم بھی نہیں دے سکتا۔ انارکلی بازار میں باوجود تمام ساز و سامان کے وہ حسن پیدا نہیں ہو سکا جو امین آباد پارک کے لئے گویا وقف ہو کر رہ گیا ہے۔ البتہ لاہور کی مال روڈ کا لکھنؤ کے حضرت گنج سے کوئی مقابلہ نہیں۔ لکھنؤ کے حضرت گنج میں جو رونق ایک فرلانگ کے اندر اندر نظر آتی ہے وہی رونق لاہور کی مال روڈ میں غالباً ایک میل یا ½ میل میں پھیلی ہوئی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کا حضرت گنج لاہور کی مال روڈ کا گود والا بچہ ہے۔ لکھنؤ میں علاوہ بالاخانوں کے چوک کے بازار زیریں کو جو حیثیت حاصل ہے وہ لاہور کے مختلف بازاروں میں نظر آتی ہے۔ البتہ لاہور میں بالاخانوں والا بازار دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لہذا چوک کے بام معصیت کا مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا۔ لکھنؤ میں پارک آپ کی دعا سے بہت ہیں لیکن لاہور میں صرف ایک پارک ہے جو مع ایک عدد نہر کے

تمام شہر کے چاروں طرف حلقہ بنائے ہوئے ہے۔ اس ’طویل الیپار کی (عربی میں پ کا اضافہ ایجاد بندہ ہے) کا کوئی جواب نہیں۔

ڈاکٹر صاحب سے ہم کو اس معاملہ میں پہلے بھی اختلاف تھا اور اب بھی ہے کہ وہ لاہور کے ریلوے اسٹیشن کے مقابلہ میں لکھنؤ کے ریلوے اسٹیشن کو منہدم کر دینا چاہتے تھے۔ ہم کو لکھنؤ کا ریلوے اسٹیشن ہر حیثیت سے بہت پسند ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ لاہور کا اسٹیشن بہتر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لاہور کا ریلوے اسٹیشن لکھنؤ سے کہیں بڑا ہے۔ مگر لکھنؤ کے جدید ریلوے اسٹیشن کی خوبصورتی اور موزونیت کا لاہور کے بے تکے عظیم الشان اسٹیشن سے کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ لکھنؤ کا اسٹیشن تو قابل انجنیروں کی آمد ہے۔ اور لاہور کا اسٹیشن تو ایک ایسا طول طویل قصیدہ معلوم ہوتا ہے، جس میں سب آورد ہی آورد ہو۔ بہر حال اسٹیشن کے معاملہ میں لکھنؤ ہی بڑھا ہوا ہے۔

لاہور میں ہم کو جو نئی چیز کھلائی گئی وہ مچھلی تھی۔ جو وہاں عام طور پر بازاروں میں تلی تلائی فروخت ہوتی ہے۔ اور واقعی لاجواب ہوتی ہے۔ ہم لکھنؤ والوں کو مشورہ دیں گے کہ وہ بھی اس کاروبار کی طرف متوجہ ہوں لیکن جس وقت لکھنؤ والے ٹنڈے کے یہاں کے کباب رکھ دیں گے تو ہم بھی چپ ہو جائیں گے۔ اور ہم ہی پر منحصر نہیں ہے، ہر انصاف پسند شخص کو یہی لکھنا پڑے گا کہ ان دونوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔ لاہور میں دودھ یقیناً لکھنؤ سے بہتر ہوتا ہے مگر لکھنؤ کی بالائی پھر لکھنؤ کو سربلند کر دیتی ہے۔ لاہور میں پھلوں اور ترکاریوں کی کثرت ہے اور لکھنؤ کو اس معاملہ میں نہایت فراخ دلی کے ساتھ لاہور کی افضلیت کا اعتراف

کرلینا چاہیئے، لیکن جب لاہور کے سامنے لکھنؤ اپنی گلاب ریوڑیاں چکن سازی اور جامدانی کامدانی۔ زردوزی وغیرہ کے کمالات پیش کرے تو لاہور کی شرافت یہی ہے کہ وہ بھی گردن جھکالے۔ اور ذرا ڈاکٹر صاحب سے بھی کہہ دے کہ وہ بھی مان لیں۔

ڈاکٹر صاحب نے لاہور کی متعدد سڑکوں پر کثیر التعداد لاریاں اور ٹیکسیاں کھڑی ہوئی دکھائیں۔ اور ہم نے اعتراف کیا کہ واقعی لکھنؤ میں مجموعی طور پر اس قدر لاریاں یا ٹکسیاں نہیں ہیں جس قدر لاہور کے ہر اڈہ پر نظر آتی ہیں لیکن جب ڈاکٹر صاحب ہم کو لاہور کا چڑیا گھر المتخلص بہ زُو دکھانے لے گئے تو خود ان کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ لکھنؤ کا زُو لاہور کے اس زُو کا استادِ معظم نظر آتا ہے۔

خیر ان تمام چیزوں کو چھوڑیئے۔ کہاں تک مکانوں۔ دوکانوں۔ گلی کوچوں اور چرندوں پرندوں۔ درندوں کا ذکر کیے جائیں۔ اصلی چیز تو انسان ہیں، جن کا مقابلہ گویا اس موازنہ کی جان ہے۔ ہم جب تک لاہور نہیں گئے تھے ہمارے ذہن میں معلوم نہیں کیوں پنجابیوں کے متعلق یہ خیال جما ہوا تھا۔ کہ وہ انسانی شکل کے درندے ہوتے ہیں۔ ان میں بہت زیادہ وحشت ہوتی ہے۔ وہ آدم خوروں کی طرح یوپی کے مہذب انسانوں کے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔ وہ بالکل لٹھ ہوتے ہیں۔ ان سے کوئی تعجب نہیں کہ وہ بات کرتے کرتے بھنبوڑ کھائیں منہ نوچ لیں اٹھا کر پٹک دیں۔ مار ڈالیں یا کھا جائیں۔ غالباً یہ خیال اس لئے ذہن میں جما ہوا تھا کہ پنجاب کی طرف سے جو شلوارییئے یو۔ پی میں آتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ ان میں وہی وحشت تھی جس سے ہم کچھ سہم سے گئے تھے۔ دوسرے لکھنؤ میں جن پنجابیوں سے نیاز حاصل ہوا تھا وہ بھی کچھ بہت زیادہ انسان نہیں معلوم ہوتے تھے۔

اور ان کو دیکھ کر ہم نے پنجاب بھر کے لئے وہی رائے قائم کر لی تھی جو خود ان کے متعلق قائم کی تھی۔ لیکن پنجاب پہنچ کر ہمارے تمام شبہات غلط ثابت ہوئے اور ہم نے دیکھا کہ یہ تو لکھنؤ۔ دہلی۔ کان پور۔ آگرہ وغیرہ کی طرح انسانوں کی بستی ہے بلکہ ہم نے اپنے پنجابی میزبانوں کو لکھنؤ اور یوپی کے میزبانوں سے کہیں زیادہ متواضع پایا۔ یہ سچ ہے کہ تمام لاہور میں میاں ایم۔ اسلم۔ حافظ محمد عالم۔ مسٹر احمد حسین اور بابو عبدالحمید کی طرح انسان نہ ہوں گے لیکن اس طرح تو لکھنؤ میں بھی اُن حضرات کی کمی نہیں ہے جو بات کا جواب لٹھ سے دیتے ہیں۔ اور مہمان کی صورت دیکھ کر گھر ہی سے بھاگ جاتے ہیں۔ البتہ ایک بات ہے کہ بیچارے پنجابیوں کو وہ تصنّع اور وہ سر عزیز کی قسم کھا کھا کر جھوٹ بولنے والی تہذیب نہیں آتی بلکہ وہ اس معاملہ میں نرے بدتمیز ہیں۔ وہ تو بس خلوص برتتے ہیں۔ خواہ وہ کسی طرح برتا جائے۔ یہ نہیں کہ مہمان کے آنے سے خون تو خشک ہو گیا ہے اور دم بھی نکلنے کے قریب ہے مگر چہرہ پر مصنوعی تبسّم پیدا کر کے زبان سے یہی کہا جا رہا ہے کہ "واللہ ہے کہ بڑی خوشی ہوئی آپ کے سر عزیز کی قسم کہ گھر میں سے بھی آپ کی تشریف آوری پر بڑی خوش ہیں۔" اور بیچارے پنجابی میزبان کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ ع جو دل میں وہ زبان پر اللہ جانتا ہے۔ نہ اُن کی "گھر میں سے" اس قدر زیادہ خوش ہوتی ہیں۔ اور نہ ان کا مہمان کو دیکھ کر دم نکل جاتا ہے۔ یا ممکن ہے کہ یہ بات صرف اسلم ہی صاحب کے یہاں ہو مگر نہیں ہمارے خیال میں پنجاب واقعی تہذیب کے اس معیار پر نہیں پہنچا ہے جہاں تصنّع اور ریاکاری لازمۂ تہذیب بن جاتے ہیں۔ وہاں اگر آپ اپنے میزبان سے رخصت ہو رہے ہیں

وہ تو صرف یہی کہے گا کہ "ارے یار ابھی کہاں جائے گا کچھ اور تو ٹھہر" لیکن جب آپ اس کے بعد بھی اصرار کریں تو اس کو آپ کے اصرار کا فوراً یقین آجائے گا۔ اور وہ خواہ مخواہ مصر ہو کر آپ کا پروگرام خراب نہ کرے گا۔ مگر لکھنؤ کے میزبانوں کی یہ شان ہوتی ہے کہ دل تو چاہتا ہے کہ مہمان کسی طرح کل کا جاتا آج چلا جائے مگر جب مہمان بستر اٹھائے گا تو میزبان صاحب فوراً کسی مشہور فلم اسٹار کی طرح ایکٹنگ شروع کرتے ہوئے فرمائیں گے۔ "واللہ یہ نہ ہوگا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے، قسم ہے خدا کی کبھی نہ جانے دوں گا۔ اجی نقصان نہیں نقصان کا باپ ہو جائے۔ ہوگا بھی دفتر تار دے دیں گے۔ مگر آپ کے سر کی قسم آج نہ جانے دیں گے۔ اور وہ تمہاری بھاوج بھی تو کہہ رہی ہیں کہ ایسی بھی کیا جلدی کی جی نہیں جی نہیں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ قسم ہے تم کو جو اب جانے کا نام لو اچھا کل۔ اچھا شام کی گاڑی سے۔ واللہ دل شکنی نہ کرو۔ خدا گواہ ہے سخت افسوس ہوگا۔ خیر تمہاری مرضی۔" اور جب وہ چلا جائے گا تو گھر میں جا کر کہیں گے کہ بڑی مشکل سے گیا ہے۔ میں نے بھی زیادہ نہیں روکا۔ خیر خس کم جہاں پاک، نہ لاہور میں یہ ہوتا ہے کہ آپ کو دور سے آتا ہوا دیکھ کر تو چپکے سے کہا کہ آرہا ہے کم بخت خدا جانے اس وقت کہاں آمرا لیکن جب آپ نزدیک پہنچے تو فرشی سلام کرتے ہوئے آپ سے کہا۔ "آیئے آیئے بسم اللہ آپ ہی کا بخدا اس وقت ذکر خیر ہو رہا تھا۔" ہم نے یہ تہذیب نہ تو اپنے میزبانِ خصوصی میاں ایم۔ اسلم میں دیکھی اور نہ اس معیار پر اپنے میزبانانِ عمومی کو مہذب پایا۔ واقعی اس اعتبار سے تو پنجاب والے سخت بدتمیز ہیں۔ معاف کریں ہم کو ایم۔ اسلم صاحب بھی اور حافظ محمد عالم صاحب، مسٹر

احمد حسین صاحب اور بابو عبد الحمید صاحب وغیرہ بھی۔

اب رہ گئی پنجاب والوں کی وہ خصوصیت جس کی بدولت وہ یو۔ پی میں ڈھگے کہلاتے ہیں یعنی ان کی زبان۔ ان کا لباس۔ ان کی حرکات۔ ان کی معاشرت وغیرہ تو لکھنؤ والوں کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ جس طرح وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر پنجابیوں کا مذاق اڑاتے ہیں اسی طرح پنجابی بھی لکھنؤ والے تکلفات اور لکھنوی تہذیب کا وہ خاکہ اڑاتے ہیں کہ لکھنؤ والے رو رو دیں۔ جس طرح لکھنؤ والے پنجابیوں کو ڈھگے کہتے ہیں اسی طرح پنجاب میں اہل یو۔ پی کا خطاب "ہندوستوڑے" ہے لکھنؤ کے لئے پنجابیوں کی شلوار جس طرح مضحکہ خیز اور بے ڈول سی چیز ہے۔ اسی طرح وہ لکھنؤ کے چوڑی دار پاجامہ کی نسائیت کو ناک پر انگلی رکھ کر مکمل کر دیتے ہیں جس طرح لکھنؤ والے پنجابیوں کی بے ساختگی اور بے تکلفی پر آوازے کستے ہیں اسی طرح پنجاب والے لکھنؤ کے "اجی حضت آپ، نہیں حضت آپ، اجی حضت پہلے آپ، نہیں حضت پہلے آپ، حضت پہلے آپ ہی۔ نہیں حضت پہلے آپ ہی" کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم کو تھیٹر کے کامک کی ایک نقل یاد آگئی۔ کہ ایک نواب صاحب کے یہاں ایک نوکر لکھنوی تہذیب کا مجسمہ تھا۔ ایک مرتبہ نواب صاحب نے اس پر بگڑ کر دوسرے نوکر سے کہا کہ لگاؤ اس کو جوتے۔ چنانچہ جیسے ہی وہ دوسرا نوکر جوتا لے کر بڑھا ہے، یہ مہذب نوکر بے ساختہ نواب صاحب کی طرف ہاتھ اٹھا کر بول اٹھا پہلے آپ کو، نواب صاحب نے غصہ میں کہا لگاؤ جوتے، نوکر نے پھر کہا نہیں حضت پہلے آپ کو۔ بالکل اسی طرح پنجاب والے لکھنؤ کے تکلفات کا مذاق اڑاتے ہیں لکھنؤ

کے لئے جو باتیں باعثِ فخر ہیں وہ پنجاب کے لئے باعثِ ننگ اور پنجاب کے لئے
جو باتیں باعثِ فخر ہیں وہ لکھنؤ کے لئے باعثِ ننگ یعنی بالکل ع۔ آنچہ در کردار فخر تست
آں ننگ من است والا قصہ ہے لیکن اس اجتماعِ ضدین میں ہم تھانوی قسم
کے لوگوں کے لئے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ لاہور کی تہذیب کو اصلی تہذیب
سمجھیں یا لکھنؤ کی تہذیب کو۔ اور اگر ان دونوں میں سے کسی ایک جگہ کی تہذیب
کو اپنے لئے منتخب کر لیا تو بھی یہ مصیبت باقی رہ جاتی ہے کہ دوسری جگہ کے لوگ
ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ اگر لاہور کی طرف ڈھلکے تو لکھنؤ والے منہ چڑائیں گے اور
اگر لکھنؤ کی طرف جھکے تو لاہور والے نکو بنائیں گے۔ اس صورت میں سب سے
بہتر صورت تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ اپنے تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کی تہذیب
کو اصلی تہذیب سمجھیں اور اس کے بعد جو کچھ بھی ہے اس کو بدتہذیبی سمجھ لیں
لیجئے قصہ ختم۔

احمق اداکار

عشق یا حماقت نامی مزاحیہ فلم کا ڈائریکشن دیتے دیتے یکایک ڈائریکٹر جہانگیر نے ایک گرجدار آواز کے ساتھ شوٹنگ بند کرنے کا حکم دیا۔ اور عاشق کا پارٹ کرنے والے ایکٹر سہراب کو بلا کر نہایت ترش لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

تم نے اس فلم کو دو کوڑی کا بھی نہیں رکھا، تم اس قدر احمق ہو کر تم سے حماقت کی اداکاری بھی نہیں ہو سکتی۔

سہراب نے مری ہوئی آواز میں کہا، ”میں تو احمق ثابت ہونے کی امکانی کوشش کر رہا ہوں مگر——“

ڈائریکٹر جہانگیر نے ڈانٹ کر کہا، ”مگر وگر کچھ نہیں، تم سے ہم کام نہیں لے سکتے۔ جس قدر بھی یہ فلم بن چکا ہے وہ گویا بیکار ہو گیا۔ ہم اس کی شوٹنگ از سر نو شروع کریں گے، اور تمھاری جگہ کے لئے کوئی دوسرا آدمی آئے گا تم اپنا حساب کر کے جا سکتے ہو۔“

اس فلم کی ہیروئن سلمیٰ اب تک خاموش کھڑی تھی۔ لیکن اب وہ بھی آگے بڑھی اور ایک ادائے دلبری کے ساتھ مسکرا کر اس نے کہا۔

”آپ خواہ کسی کو بلائیں، مگر جو بات آپ چاہتے ہیں وہ اداکاری میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔“

ڈائرکٹر نے تعجب سے کہا، کیا مطلب ہے تمہارا؟ یعنی ایک بے وقوف عاشق کی اداکاری ممکن ہی نہیں؟"

سلمیٰ نے ذرا بل کھا کر کہا۔ "ممکن کیوں نہیں ہے، مگر آپ نقل کو اصل بنانا چاہتے ہیں، یہی ناممکن ہے۔"

ڈائرکٹر نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "بے شک اداکاری اسی کا نام ہے کہ نقل بھی اصل معلوم ہو، کیا تم نہیں دیکھ رہی تھیں کہ جب سہراب ٹھنڈی سانس بھر رہا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ اس کو یا تو دمہ کی بیماری ہے یا منہ سے فٹ بال میں ہوا بھر رہا ہے، جب ایسی معمولی بات ان سے پوری نہ ہوئی تو اور کیا امید کی جائے، ہم ان سے کام لے کر اپنا فلم غارت نہیں کریں گے۔"

سلمیٰ نے ہنس کر کہا۔ "اگر آپ احمق کی اداکاری کے لئے یوں ہی ڈائرکشن دیتے رہے اور ایکٹروں کو زبردستی احمق بناتے رہے تو یہ فلم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

ڈائرکٹر نے چیں بجبیں ہو کر کہا۔ "میں اپنی ڈائرکٹری کی عمر میں اس قسم کی باتیں پہلی مرتبہ سن رہا ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

سلمیٰ نے ڈائرکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، میں بتاؤں آپ کو کہ یہ فلم کیونکر تیار کرنا چاہیئے۔"

ڈائرکٹر نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

"میں تو گویا گدھا ہی ہوں، اچھا بتایئے آپ کیا بتاتی ہیں۔"

سلمیٰ۔ اس کی ترکیب صرف یہ ہے کہ نہ اس ڈرامہ کا فلم بنے، نہ آپ ڈائرکشن دیں۔ اور نہ کوئی ہیرو اداکاری کے جوہر دکھلائے۔

ڈائرکٹر۔ (بات کاٹ کر) میں اس وقت مذاق کرنے کے لئے نہیں کھڑا ہوں، اور اگر تم نے اس گستاخانہ طرز کو نہیں بدلا تو تم کو ابھی نگار خانہ خالی کر دینا پڑے گا۔

سلمیٰ نے جلدی سے کہا۔ سنیئے تو سہی پوری بات۔ آپ خواہ مخواہ خفا ہو رہے ہیں۔ میں بالکل سنجیدگی سے گفتگو کر رہی ہوں۔ ہاں تو آپ صرف کیمرہ مین کو حکم دیجیے کہ وہ میرے ساتھ رہیں اور جہاں میں اشارہ کر دوں بس وہیں پر شوٹنگ شروع کر دیں۔ پھر دیکھیئے کہ میں آپ کو آپ کے فلم کے لئے کس قدر لاجواب احمق دیتی ہوں۔ دراصل اس قسم کے احمق بنائے نہیں جا سکتے۔ بلکہ بنے بنائے ملتے ہیں۔ البتہ جستجو شرط ہے، بہرحال یہ میرا ذمہ ہے کہ اگر آپ اس فلم کو ناقص قرار دیں گے تو تمام نقصان میرے ذمہ واجب الادا ہوگا۔

ڈائرکٹر جہاں گیر کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ لیکن چونکہ وہ بے ساختہ تائید کرنا اپنی ڈائرکٹری کے وقار کے خلاف سمجھتے تھے لہٰذا صرف اسی قدر کہا:۔

”بہت بہتر ہے، لے جائیے کیمرہ مین کو اپنے ہمراہ۔ ایک تجربہ یہ بھی سہی۔“

(۲)

جس وقت سلمیٰ اپنے غارت گر حسن کو اپنے زرّیں لباس سے چمکاتی ہوئی رسٹوران میں پہنچی۔ وہاں ہر طرف چھوٹی چھوٹی میزوں کے کرسیوں پر مختلف ٹولیاں جمع تھیں۔ بھانت بھانت کے انسان نظر آ رہے تھے۔ گو سلمیٰ

کے رسٹوران میں داخل ہوتے ہی تقریباً سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئی تھیں مگر وہ ہر طرف دیکھتی ہوئی ایک خالی میز کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اور بوائے کو چائے لانے کا حکم دیا۔ سلمیٰ کی میز کے قریب ہی ایک میز پر ایک ادھیڑ عمر کے بزرگوار تشریف فرما تھے جو بظاہر اودھ کے باشندے معلوم ہوتے تھے، اس لئے آپ کے جسم پہ وہی شربتی انگرکھا تھا، جو لکھنؤ کے چوک میں اکثر موسم گرما کی راتوں میں نظر آجاتا ہے۔ سر پر وہی واجد علی شاہی دوپلی چنی ہوئی ٹوپی تھی، اور چوڑی دار پاجامہ اس شاہی زمانہ کے سوٹ کی تکمیل کر رہا تھا۔ یہ حضرت بھی چائے کی پیالی سامنے رکھے ہوئے تھے۔ مگر جس وقت سے سلمیٰ رسٹوران میں داخل ہوئی تھی انھوں نے اپنی پیالی سے کوئی گھونٹ نہ پیا تھا، بلکہ ان کو اس کا بھی خیال نہ تھا کہ چائے ٹھنڈی ہو کر شربت لیلڑ) بن چکی ہے۔ وہ حضرت دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر سلمیٰ کو اس بری طرح گھورنے میں مصروف تھے کہ پلک تک جھپکانے میں کفایت شعاری سے کام لے رہے تھے، ادھر سلمیٰ کا یہ حال کہ وہ بھی گو ان کی طرف براہ راست نہیں دیکھ رہی تھی، مگر ان کے علاوہ باقی تمام رسٹوران سے بے خبر تھی اور کبھی دیکھتی تھی تو ترچھی نظروں سے اس طرف دیکھتی تھی جس طرف یہ حضرت اسٹیچو بنے بیٹھے تھے۔

سلمیٰ نے اپنی چائے ختم کی اور نہایت باریک آواز میں بوائے کو اس طرح آواز دی کہ وہ کمزور اور دھیمی آواز بجائے بوائے کے ان حضرت تک پہنچ کر رہ گئی، لہٰذا ان حضرت نے ذرا مردانہ آواز میں بوائے کو پکارا اور جب وہ آگیا تو سلمیٰ کی طرف اشارہ کر دیا کہ آپ بلا رہی ہیں"۔

سلمیٰ نے آپ کی اس عنایت کے جواب میں تبسم زیر لب کے ساتھ کہا "شکریہ" آپ نے ریشہ خطمی ہوتے ہوئے فرمایا "نہیں! اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے آپ خواہ مخواہ محجوب فرماتی ہیں"

سلمیٰ نے سوائے ہنس دینے کے کوئی جواب نہ دیا۔ اور بل ادا کر کے ان حضرت کی طرف دیکھتی ہوئی ریسٹوران کے باہر چلی گئی۔

سلمیٰ کے جاتے ہی آپ نے بھی اپنی ٹھنڈی چائے سے بھری ہوئی پیالی کی قیمت ادا کی اور لپکتے ہوئے ریسٹوران سے باہر آگئے، یہاں دیکھا تو سلمیٰ کوئی پانچ ہی قدم آگے بڑھی تھی۔ لہذا آپ بھی اس فاصلہ کو قائم رکھتے ہوئے اس کے نقش قدم پر چلنے لگے۔ سلمیٰ تھوڑی دور پر جا کر ایک پارک کی طرف مڑ گئی لہذا آپ بھی اس موڑ پر پہنچے تو اسی سمت مڑ گئے، اور اب آپ نے یہ کوشش شروع کر دی کہ یہ فاصلہ کم ہو جائے، چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں آپ سلمیٰ سے صرف تین چار قدم پیچھے رہ گئے ہوں گے کہ چلتے چلتے یکایک سلمیٰ کا پیر پھسل گیا اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ گر پڑی، یہ افتاد گویا ان حضرت کے لئے "بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا" قسم کی افتاد تھی۔ لہذا آپ نے جھپٹ کر سلمیٰ کو اٹھایا، اور جب دیکھا کہ وہ بہت ہی بے چین ہے تو بلا تکلف زمین پر بیٹھ کر اس کو اپنے زانو پر لٹایا۔ شکر ہے کہ یہ جگہ پارک کا وہ گنجان حصہ تھی جہاں سوائے جھاڑیوں کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ لہذا اس طرف عام طور پر لوگ آتے ہی نہ تھے، دوسرے یہ تو ایک ایسا ناگہانی واقعہ تھا کہ خواہ کسی چوراہے پر ہوتا بہرحال اس کے نتائج یہی ہوتے جو اب ہوئے،

سلمیٰ نے تھوڑی دیر تک اپنے پیر کو ملا۔ اور جب ذرا سکون ہو گیا تو وہ

فوراً ان حضرت کے زانو سے اٹھ کر الگ ہوگئی، اور مسکرا کر اپنا آنچل درست کرتے ہوئے کہا:۔

آپ کی اس مہربانی کا شکریہ، اس وقت آپ فرشتۂ رحمت ثابت ہوئے۔

آپ نے فرمایا، اس میں مہربانی کی کونسی بات ہے، یہ بتائیے خدانخواستہ چوٹ زیادہ تو نہیں آئی۔

سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جی نہیں میرے تو چوٹ نہیں آئی مگر مجھ کو سنبھالنے کی کوشش میں آپ کے تو چوٹ نہیں لگی؟

آپ نے آہ سرد بھرتے ہوئے کہا، "میری چوٹ کے متعلق آپ کیوں دریافت کرتی ہیں، میری چوٹ ایسی نہیں ہے جو دکھائی جا سکے"

سلمیٰ نے بھولے پن سے پوچھا، اگر دکھائی نہیں جا سکتی تو کم سے کم بتا ہی دیجئے، کہ کیا خدانخواستہ بہت ہی شدید ہے۔

آپ نے حسرت بھری نظروں سے سلمیٰ کو دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا، پھر رک کے اور دل کی گہرائیوں سے ایک ٹھنڈی سانس کھینچنے کے بعد کہا:۔

"نہیں میری چوٹ دکھائی بھی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ آپ دیکھنا چاہیں اس کے متعلق سب کچھ بتایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ آپ سمجھنے کی کوشش کریں، اور اس چوٹ کا علاج بھی ممکن ہے، بشرطیکہ آپ چارہ گری کریں، مگر میں جانتا ہوں کہ آپ کا کام چارہ گری نہیں ہے۔ بلکہ بیمار بنانا ہے، آپ زندگی نہیں بخش سکتیں بلکہ موت عطا کر سکتی ہیں، لہٰذا کیا کیجئے گا، میری چوٹ کے متعلق پوچھ کر"

سلمیٰ نے گھبرا کر کہنا شروع کیا:۔

میرے محسن اگر آپ کو میری وجہ سے کوئی تکلیف پہنچی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔ مگر یقین جانئے کہ میں نے دانستہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی ہے آپ فرمائیے کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ اور اپنے محسن کو تکلیف سے بچانے کی انتہائی کوشش کروں گی"۔

ان حضرت نے ذرا خوش ہو کر کہا:-

کیا واقعی مجھ کو تکلیف سے بچانے کی کوشش کرو گی؟

سلمیٰ نے فوراً کہا:-

"آپ یقین جانئے کہ ہر ممکن کوشش کروں گی"۔

ان حضرت نے اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے فدویانہ انداز سے پوچھا:-

بانو! آپ کا نام؟

سلمیٰ نے سنجیدگی سے جواب دیا:- "میرا نام سلمیٰ ہے۔ اور میں بمبئی میں حصولِ تعلیم کے لئے آئی ہوں، یہاں ایک مکان لیا ہے، جس میں تنہا رہتی ہوں اور اپنے تعلیمی مشاغل میں مصروف رہتی ہوں۔ اور آپ اپنی تعریف فرمائیے"۔

ان حضرت نے کہا، میرا نام اکبر مرزا ہے اور لکھنؤ وطن ہے۔ محض تفریحاً بمبئی آیا ہوا ہوں اور اپنے ایک عزیز کے یہاں نل بازار اسٹریٹ پر ٹھیرا ہوا ہوں۔ اب تک میں بالکل اچھا تھا۔ بمبئی کی تفریح سے لطف اٹھا رہا تھا مگر آج آپ نے مجھ کو کہیں کا نہ رکھا کیا واقعی آپ میرے درد کی دوا دیں گی؟"

سلمیٰ نے سادگی سے کہا:-

نہ میں حکیم۔ نہ ڈاکٹر۔ بھلا درد کی دوا کیا دوں گی۔ البتہ کسی ڈاکٹر سے لا دوں گی

آپ بتایئے تو سہی کہ آپ کا کیا حال ہے!"

اکبر مرزا نے اپنے چہرہ سے اپنی دلی کیفیات نمایاں کرکے کہنا شروع کیا:۔

"میں آج سے پہلے درد سے واقف نہ تھا، غم سے بالکل بے خبر تھا، مجھ کو نہیں معلوم تھا کہ انسان کو نظروں ہی نظروں میں کیونکر پامال کیا جا سکتا ہے، اور ایک انسان کی زندگی میں محض چند ساعتیں کیونکر انقلاب عظیم پیدا کر دیتی ہیں، مگر (ایک آہ بھر کر) آج میں نے سب کچھ دیکھ لیا، اور آپ نے سب کچھ دکھا دیا، اب میری زندگی آپ پر منحصر ہے اور میں آپ ہی کے لطف و کرم پر زندہ رہ سکتا ہوں۔ ورنہ جو کیفیت مجھ پر طاری ہے وہی میری موت بن کر رہے گی۔ اور میں آپ ہی کے قدموں پر اپنی جان دے دوں گا!"

سلمیٰ نے گھبرا کر کہا:۔

"آپ خواہ مخواہ ایسی باتیں کہہ رہے ہیں، آخر کچھ کہیئے تو سہی!"

اکبر مرزا نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ بھرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا:۔

"میں کہتا ہوں، مگر دیکھو پھر نہ کہنا کہ تو نے کیوں کہا اور یہ بھی خوب سمجھ لو کہ اب میری قسمت کا فیصلہ صرف تمہارے ہاں اور نہیں پر ہے۔ بہر حال میں اپنی قسمت کے فیصلہ سے بے خبر ہو کر تم سے صرف یہ کہتا ہوں کہ ـــ مجھ کو ـــ تم ـــ سے ـــ محبت ـــ ہے!"

سلمیٰ نے وحشت ناک چہرہ بنا کر کہا۔ "محبت"

اکبر مرزا نے آنسو ٹپکاتے ہوئے جواب دیا:۔

"ہیں میں گنہگارِ محبت ہوں اور اگر محبت کوئی جرم ہے تو میں حاضر ہوں مجھ کو سزا دو اور مجھ کو میری سزا کو پہنچا دو۔"

سلمیٰ نے بے رخی کے ساتھ کہا "مگر میں نے آپ کے متعلق ایسی پست رائے قائم نہیں کی تھی۔ افسوس کہ آپ مجھ کو میری توقع کے خلاف ثابت ہوئے میں آپ سے معافی چاہتی ہوں، مجھ کو جانے کی اجازت دیجئے؟"

سلمیٰ کے اٹھتے ہی اکبر نے اس کے قدموں پر سر رکھ دیا، اور اس طرح رونا شروع کیا کہ مجبوراً سلمیٰ نے اس کا سر اٹھاتے ہوئے کہا:۔

"ارے واہ! بیکار اپنی کیوں جان دیتے ہو۔ اپنے ہوش میں آؤ، اور اس دیوانگی کو چھوڑ کر میرے مکان پر چلو۔"

اکبر مرزا آنسو پونچھتے ہوئے اور سسکیاں بھرتے ہوئے سلمیٰ کے ساتھ ہو لئے۔

(۳۴)

سلمیٰ نے اپنے مکان پر جا کر اکبر کو نہایت پُرتکلف قسم کی چائے پلائی اور اِدھر اُدھر کی باتوں سے اس کا دل بہلاتی رہی، مگر اکبر اسی طرح بیٹھا رہا گویا دنیا سے بیزار ہے، پھر بھی اس کو سلمیٰ کی اس توجہ سے بہت کم امیدیں تھیں ورنہ اگر وہ پارک ہی میں اس کی محبت کو جوتی پر مار کر چلتی ہوتی تو اس کا کوئی کیا کر لیتا۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر سلمیٰ نے خود ہی کہا:۔

"اکبر صاحب، مجھے سخت افسوس اور ندامت ہے کہ میری وجہ سے آپ کو یہ تکلیف ہوئی، مگر میں آپ سے کیا عرض کروں کہ مجھ کو شاید دنیا کے کسی اور

لفظ سے اس قدر تنفر نہیں ہے، جس قدر محبت سے ہے، میں محبت کو ہوسناکی کا وہ درجہ سمجھتی ہوں، جہاں پہنچ کر انسان وحشی جانور بن جاتا ہے، میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ بھی خدا نخواستہ ایسے ہی ہیں۔ لیکن مجھ کو یہ اندیشہ ضرور ہے۔ کہیں محبت آپ کو بھی نصیب دشمناں ایسا ہی نہ بنا دے۔"

اکبر نے بات کاٹ کر کہا:۔

"نہیں نہیں آپ شوق سے مجھ کو وحشی جانور سمجھیں، مگر جانور ہی بنا کر مجھ کو اپنا سمجھ لیجئے، آپ کو محبت سے تنفر ہے اور بالکل ٹھیک ہے، محبت کو بدنام کرنے والے ہوسناکوں نے محبت کو اس طرح بدنام کیا ہے کہ آج دنیا میں محبت کا وجود ہی نہیں ہے، مگر آہ میں کیونکر آپ کو بتاؤں کہ میں ان ہوسناکوں میں نہیں ہوں اور میں آپ کو کیونکر یقین دلاؤں کہ مجھ کو آپ سے واقعی محبت ہے۔"

سلمٰی نے ذرا طنز کے ساتھ کہا:۔

"مجھ کو یقین ہے کہ آپ کو محبت ہے، ضرور ہے، مگر ایسی ہی محبت ہے کہ آپ اس کا یقین دلانا چاہتے ہیں، خود بخود یقین نہیں ہو سکتا۔ آپ اس محبت کی صداقت جتا رہے ہیں اور بغیر صداقت جتائے ہوئے اس کی صداقت روشن نہیں ہو سکتی، حالانکہ محبت ان تمام تکلفات سے بے نیاز ہے۔ اس کو ظاہر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ اس کے لئے یقین لانے یا انکار کرنے کی کوئی حاجت ہے۔"

اکبر نے لاجواب ہو کر کہا:۔

"اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہے کہ آپ کو میری محبت کا

یقین نہیں، خیر نہ کیجئے یقین اور نہ اب میں یقین دلاؤں گا اگر افسوس تو یہ ہے کہ آپ کو اب میرے اس جذبہ حقیقی کا اس وقت یقین آئے گا جب میں اس دنیا میں نہ ہوں گا۔“

سلمیٰ نے کہا:۔

”خیر خدا نہ کرے کہ وہ وقت آئے اور خدا کرے کہ مجھ کو اس سے پہلے محبت میں صداقت نظر آ جائے، بہر حال میں یہ ضرور کہوں گی کہ اگر واقعی آپ کے دل میں میرے لیئے محبت ہے تو آپ کو اس کی وکالت کی ضرورت نہیں، آپ خاموش رہیئے۔ محبت خود متوجہ کر لے گی۔“

اکبر نے جز بز ہو کر کہا:۔

”میں مجبور ہوں کہ آپ کو دل نہیں دکھا سکتا، اگر اپنی پسلیاں چیر کر دل دکھا سکتا تو یقین جانئے کہ آپ کو میرے دل میں سوائے اپنی تصویر کے اور کچھ نہ ملتا۔“

سلمیٰ نے ایک طعن آمیز تبسم کے ساتھ کہا۔

”کیا آپ دل چیر کر نہیں دکھا سکتے، کیوں؟ آخر اس میں کونسی مجبوری ہے، اگر آپ واقعی مجھ سے محبت کرتے ہیں تو محبت کی صداقت کا یہ ثبوت پیش کرنے میں تامل کیوں ہے؟“

اکبر: ”یعنی تم میرا دل میرے سینے سے باہر دیکھنا چاہتی ہو، اچھا تو میں اپنی صداقت کا یہ ثبوت پیش کرنے کو تیار ہوں!“

سلمیٰ نے فوراً اٹھ کر ایک چمکدار خنجر اٹھایا اور اکبر کو دیتے ہوئے کہا:۔

"لیجیے۔ مگر دیکھیے محبت کا نام نہ ڈبوئیے گا!"

اکبر نے تھرتھراتے ہاتھوں میں خنجر لے کر لرزتے ہوئے کہا:-

"کیا واقعی سچ مچ دل نکال لوں؟"

سلمیٰ نے لاپروائی سے کہا:-

"اور نہیں تو کیا میں مذاق کر رہی ہوں!"

اکبر نے سلمیٰ کی طرف غور سے دیکھا اور چہرہ پر تبسم پیدا کر کے کہا: "کیوں خواہ مخواہ مذاق کرتی ہو!"

سلمیٰ نے تڑ کی بہ تڑ کی کہا:-

"اچھا تو گویا آپ اتنی دیر سے محبت کا مذاق اڑا رہے تھے، اور اگر آپ کی محبت سنجیدہ تھی تو میں بھی آپ سے سچ کہتی ہوں، یا تو اپنا دل نکال کر دکھلائیے ورنہ میں آخری مرتبہ کہتی ہوں کہ آئندہ سے لفظ محبت میرے سامنے اپنی زبان سے نہ نکالئے گا!"

اکبر نے یہ سنتے ہی آنکھیں بند کر کے اپنے دانت بھینچ لیے، اور خنجر کو فضا میں بلند کر کے زور سے آہ سلمیٰ کا نعرہ بلند کیا اور پھر خود ہی یکایک آنکھیں کھول کر خنجر والا ہاتھ گرا لیا، سلمیٰ یہ تماشہ مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے فوراً نہایت شرارت کے ساتھ کہا:-

"واہ رے عاشق جاں باز کیا کہنا ہے اس بازی کا!"

اکبر نے نہایت جوش کے ساتھ کہا:-

"اچھا تو دیکھو رخصت!"

یہ کہہ کر خنجر پھر فضا میں بلند کر دیا، اور اپنے انگرکھے کا بند کھول کر اس طرح کانپنا شروع کر دیا کہ گویا ارادتاً خنجر لے کر رقص فرما رہے ہیں۔ پہلے تو خنجر آپ کے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں کانپتا رہا اور آخر کار چھوٹ کر چھن سے گر پڑا، اور خود اکبر صاحب منہ لٹکا کر بیٹھ رہے۔ سلمیٰ نے ہنسی سے بے تاب ہو کر کہا:۔

"میرے شہید محبت! خدا آپ کو جنت الفردوس میں جگہ دے، واقعی آپ نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا، اور محبت کو اپنے خون سے سرخرو کر دیا، مگر براہِ کرم آپ شرمندہ نہ ہوں، البتہ آئندہ ہمیشہ کے لئے یاد رکھیں کہ محبت بچوں کا کھیل نہیں ہے۔"

اکبر نے شرم سے جھکی ہوئی گردن ایک جوش کے ساتھ اٹھائی اور سلمیٰ کے تحقیر آمیز تبسم کو دیکھ کر اس کا چہرہ تمتما اٹھا، اور اس نے ڈپٹ کر کہا:۔

اچھا خیر آپ کی اس ہمدردی اور نصیحتوں کا شکریہ، اب تم بھی دیکھ لو کہ محبت کس کو کہتے ہیں۔ ؎

دیکھ اس طرح سے مرجاتے ہیں مرنے والے

سلمیٰ نے فوراً کہا:۔

ہاں مرنے والے مر تو ضرور جاتے ہیں اور روز مرتے رہتے ہیں مگر جناب اٹھتے ہوئے بہت کم دیکھا گیا ہے۔"

اکبر نے سلمیٰ کو جواب دیئے بغیر اس کھڑکی کا رخ کیا، جو اس سہ منزلہ سے سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ اور وہاں پہنچ کر نیچے جھانک کر دیکھا۔ کچھ ارادہ کیا کچھ جھجکے۔ اور آخر ایک پیر لٹکا کر سلمیٰ سے کہا:۔

"تو پھر کیا کہتی ہو، کود پڑوں؟"

سلمیٰ نے منہ پھیرتے ہوئے کہا "میں کیا جانوں آپ کو اختیار ہے۔۔۔۔"

اکبر نے کہا۔ "اچھا تو میں کودتا ہوں پھر"

سلمیٰ نے کچھ سوچا اور فوراً ہی کسی نتیجہ پر پہنچ کر وہ یکایک چیخ اٹھی

ٹھیرو! ٹھیرو!

اکبر نے دوسرا پیر اٹھاتے ہوئے کہا:۔

"نہیں اب کیوں رک گئی ہو، دیکھ ہی نہ لو محبت کی خوفناک صداقت کو"

سلمیٰ نے دوڑ کر اکبر کا بازو پکڑ لیا جس کے وہ پہلے ہی منتظر تھے۔ اور اس کے بعد ان کو کھڑکی سے ہٹا کر ایک صوفہ پر بٹھا دیا۔ اور کہا:۔

"اکبر مجھے معاف کرنا کہ میں نے مذاق کو اس قدر سنجیدہ صورت دے دی مجھ کو تمہاری محبت کا یقین ہے۔ مگر تم مجھ کو ہمیشہ کے لئے اپنی کنیز بنانے سے قبل کم از کم دو روز تو دو کہ میں غور کر سکوں۔"

اب اکبر کی جان میں جان آئی۔ اور اس نے سلمیٰ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "اچھا تو دو روز کے بعد یعنی پرسوں تم میری قسمت کا فیصلہ سناؤ گی؟"

سلمیٰ نے کہا "ہاں پرسوں شام کو۔ اچھا اکبر اب مجھ کو اجازت دو کہ میں کل کے سبق کے لئے مطالعہ کروں؟"

اکبر سلمیٰ سے رخصت ہو کر چلا گیا۔ اور سلمیٰ اس کو پہنچانے کے بعد دروازہ بند کر کے ہنسی کے مارے بل کھاتی ہوئی واپس آ گئی۔

UNIVERSITY LIBRARY

(۴)

تیسرے دن بجائے شام کے سہ پہر ہی کے وقت اکبر مرزا سلمیٰ کے مکان پر آموجود ہوئے۔ سلمیٰ نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا، اور نہایت پرتکلف چائے پلائی، لیکن اس تمام وقفہ میں اکبر صورت سوال بنے رہے، کہ کب سلمیٰ ان کی محبت قبول کرنے کا اعلان کرے۔ آخر جب نہ رہا گیا تو انہوں نے خود ہی ڈرتے ڈرتے کہا:-

"تو اب میں اپنی قسمت کو اچھا سمجھوں یا برا؟"

سلمیٰ نے ہنس کر کہا۔ "میں نہیں سمجھی؟"

اکبر نے بھی ہنس کر کہا۔ "آخر آپ نے غور کر لیا ہوگا۔ میں تو آج اپنی قسمت کا فیصلہ سننے آیا ہوں۔"

سلمیٰ نے کہا۔ "آخر ایسی کیا جلدی ہے، چلئے پہلے آپ کو ایک تماشہ دکھاؤں۔ ایک فلم تیار ہو رہا ہے۔ "عشق یا حماقت" آج اس کے دو ریل اسٹڈیو میں دکھائے جائیں گے۔ میں نے خاص طور پر آپ کے اور اپنے لئے اجازت حاصل کر لی ہے۔ وہاں سے واپسی پر پھر باتیں ہوں گی۔ مگر آپ اطمینان رکھئے فیصلہ آپ ہی کے حق میں ہوا ہے۔

یہ کہہ کر سلمیٰ اٹھ کھڑی ہوئی، اور اکبر بھی اس کے ساتھ ساتھ ہو لئے، یہ دونوں اسٹوڈیو میں پہنچے، یہاں سلمیٰ نے ایک طرف اکبر کو بٹھا دیا اور خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔

فلم شروع ہوتے ہی اکبر نے پہلے تو بڑی زور سے کہا:- "ارے" پھر آنکھیں

پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے بعد عالم استعجاب میں کرسی سے نصف کے قریب کھڑے ہو گئے اور آخر کار جب ان کی حیرت بڑھتی ہی گئی تو سلمیٰ کا شانہ جھنجوڑ کر کہا:۔

اس میں وہ شخص تو بالکل میری شکل وصورت کا ہے اور وہ عورت بالکل تمہارے جیسی ہے اور ریسٹوران بھی بالکل وہی ہے اور واقعہ بھی بالکل وہی معلوم ہوتا ہے سلمیٰ نے لاپروائی سے کہا، اونھ ہوگا بھی، تمہاری تو ایسی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ اکبر نے کہا لیکن واللہ وہ دیکھو تم پارک میں گری ہو اور وہ دیکھو میں نے تمہارا سر زانو پہ رکھا ہے۔ یعنی بالکل وہی قصہ، دیکھتے دیکھتے ہیں وہ بیٹھا ہوا ہوں۔ اور تم بالکل جیسے تم ہی ہو۔ سلمیٰ نے کہا:۔ اچھا خیر دیکھو تو سہی۔ یہ مکان بالکل تمہارا مکان ہے اور میں یقیناً میں ہوں۔ اور وہ یقیناً تم ہو۔ سلمیٰ چپ رہی، مگر اکبر نے پھر وحشیوں کی طرح کہا۔ "ارے دیکھنا تم نے سلمیٰ بالکل اسی طرح خنجر لا کر دیا ہے، جس طرح سچ مچ دیا تھا۔ وہ دیکھو میں نے خنجر لے لیا۔ سلمیٰ نے جھڑک کر کہا "تم اس قدر حیران کیوں ہو۔ کیا کبھی سینما نہیں دیکھا۔ اگر ہمارے تمہارے واقعات ملتے جلتے ہیں تو تعجب کی کونسی بات ہے۔ ہر عشق کے قصہ میں یہی واقعات پیش آتے ہیں"

اکبر غالباً اب کی مرتبہ یہ ارادہ کر کے بیٹھے تھے، کہ اب چپ رہیں گے مگر وہ دیوانوں کی طرح ایک دم سے بے ساختہ چیخے۔

"تم کو یقین ہی نہیں آتا۔ یہ یقیناً میں ہی ہوں۔ اور وہ یقیناً تم ہی ہو۔ دیکھو تو سہی وہ میں نے کھڑکی سے پیر لٹکالا اور میں گرنا چاہتا ہوں۔ وہ دیکھو تم آ گئیں مجھ کو روک رہی ہو۔ تم لاکھ کچھ کہو، یہ ہمارا اور تمہارا ہی واقعہ ہے اور یہ ہماری اور تمہاری ہی صورتیں ہیں"

فلم ختم ہو گیا۔ اور اب روشنی میں سلمیٰ نے دیکھا تو اکبر کے چہرے پر حیرت و استعجاب کے تمام رنگ اس طرح موجود تھے کہ وہ حماقت مجسم نظر آتے تھے۔ سلمیٰ کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ مگر اکبر تو دریائے حیرت میں ایسے غرق ہوئے تھے کہ کچھ بھی نہ بولے۔ اور اس وقت تک بت بنے بیٹھے رہے جب تک ڈائرکٹر جہانگیر نے آکر ان کو مخاطب نہیں کیا۔

میں آپ کی اس نوازش کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہ آپ نے ہمارے اس فلم کو بے حد کامیاب بنایا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ جو تمثیل آپ نے پیش کی ہے وہ کسی اچھے سے اچھے ایکٹر سے بھی ممکن نہ تھی۔"

اکبر سوالیہ نشان کی طرح پہلے تو منہ کھولے ہوئے ڈائرکٹر جہانگیر کو دیکھتے رہے، اور اس کے بعد صرف یہ کہا۔ "کیا فرمایا آپ نے" سلمیٰ نے ڈائرکٹر جہانگیر سے کہا "اگر اکبر مرزا صاحب بقیہ حصہ کو بھی مکمل کرا دیں تو اچھا ہے۔"

اکبر نے یکے بعد دیگرے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ڈائرکٹر جہانگیر اور سلمیٰ کو دیکھنا شروع کیا۔ آخر کار سلمیٰ نے اکبر کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا: "تم کو اگر مجھ سے سچی محبت نہ ہوتی تو تم میرے اس فلم کو اس قدر عمدگی سے کیونکر تیار کرتے؟ بہرحال میں تم کو تمام قصہ ابھی سناتی ہوں اور اس کے بعد تم بتاؤ کہ تم اس کمپنی میں ملازمت کرنا پسند کرو گے یا نہیں؟" یہ کہہ کر سلمیٰ نے ریسٹوران سے لے کر اب تک کا تمام قصہ من و عن اکبر کو سنا دیا۔ اور آخر میں صرف یہ کہا:

"اگر تم کو مجھ سے محبت ہے تو میری قربت کا یہی ذریعہ ہو سکتا ہے کہ تم اس فلم کی تکمیل تک یا مستقل طور پر ملازمت کر لو۔"

اکبر مرزا نے سب کچھ سن کر اس طلسمِ حیرت کو سمجھا، اور اب آپ نے بھی ہنستے ہوئے کہا:۔

"دیکھئے خدا بھی روزی بہم پہنچانے کے لئے کیا کیا بہانے نکالتا ہے۔ میں لکھنو سے تلاشِ معاش میں سرگرداں یہاں تک آیا تھا۔ اور بمبئی کی خاک اڑا رہا تھا۔ اب دیکھئے یہ ملازمت ہمیں خود ہی مل گئی۔ واہ رے تیری شان!"

شوہر یا ایڈیٹر

ہم کو اس کا اعتراف ہے کہ ہم ایک شوہر ہیں، اور ہم اس کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ ہم ایک ایڈیٹر ہیں، مگر مصیبت تو یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کے نزدیک ہم صرف شوہر ہیں اور اخبار کے ڈائرکٹر صاحب ہم کو محض ایڈیٹر سمجھتے ہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ بیگم صاحبہ اور ڈائرکٹر صاحب اپنی اپنی جگہ پر ایسے مستحکم دلائل رکھتے ہیں کہ اب ہم خود فکر میں ہیں کہ دراصل ہم ایڈیٹر ہیں یا شوہر۔ اور اگر صرف ایڈیٹر ہیں تو شوہر کیسے ہو سکتے ہیں اور شوہر ہیں تو ایڈیٹر کیونکر بنے ہوئے ہیں یعنی ع ۔ اگر نہیں ہوں تو کیوں اور ہوں تو کیا ہوں میں ۔

بیگم صاحبہ کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم دراصل شوہر ہیں اور ایڈیٹری محض ایک معاشی ذریعہ ہے یعنی وہ یہ کہتی ہیں کہ اگر ہم ایڈیٹر نہ ہوتے تو بھی شوہر ضرور رہتے یعنی معاشی حیثیت سے تو یہ ممکن تھا کہ اگر ہم ایڈیٹر نہ ہوتے تو فلم ایکٹر ہوتے ۔ فلم ایکٹر نہ ہوتے تو بڑھئی ہوتے، بڑھئی نہ ہوتے تو زردوز ہوتے۔ مختصر یہ کہ سبھی کچھ ہو سکتے تھے مگر شوہر ہونا برحق تھا۔ اور بحیثیت ایک شوہر کے ہمارے لئے یہ ناممکن تھا کہ ہم کچھ اور ہو سکتے۔ یعنی کچھ ہوتے یا نہ ہوتے مگر شوہر تو ہونا ہی پڑتا۔ لہذا ثابت یہ ہوا کہ شوہر ہونا اصل حقیقت ہے اور یہ ایڈیٹری محض ایک ضمنی حیثیت ہے، ان مستحکم دلائل کے بعد اب ڈائرکٹر صاحب کے دعویٰ کو

ملاحظہ فرمائیے۔ کہ وہ بھی اپنی جگہ پر ایک ناقابل انکار استحکام کا حامل ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ شوہر ہونا تو ایک نجی اور گھریلو بات ہے، مگر اس خاکسار کی عملی اور ذمہ دارانہ حیثیت یہ ہے کہ یہ خاکسار ایڈیٹر ہے، بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ہماری شوہرانہ حیثیت ہماری ایڈیٹرانہ حیثیت کی منت پذیر ہے۔ یعنی ہم اگر ایڈیٹر نہ ہوتے تو جس آسانی کے ساتھ موجودہ اہل خانہ کے شوہر بن گئے ہیں نہ بن سکتے۔ یہ تو ممکن تھا کہ ہم ان بیوی کے نہ سہی کسی اور کے شوہر بن جاتے۔ اور شوہر ہونے کے لئے کسی خاص کاوش کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے کہ ع

تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

گویا یہ تو ایک ایسی معاملت تھی جو بغیر ہاتھ پیر ہلائے بھی ممکن تھی، مگر یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جو شخص ایڈیٹر ہونے والا ہوتا ہے، وہ دنیا کے کسی اور کام کا نہیں ہوتا۔ یا اس کو یوں کہیئے کہ ایڈیٹر وہی ہوتا ہے جو دنیا کے کسی اور کام کا نہ ہو۔ یعنی جو دنیا میں کچھ نہیں کرسکتا وہ ایڈیٹری کرسکتا ہے۔ چنانچہ اس بے روزگاری کے دور میں بے روزگاروں کی جس قدر سرپرستی صحافت نے کی ہے شاید ہی کسی اور شعبہ نے کی ہو۔ مختصر یہ کہ ڈائرکٹر صاحب کے نزدیک شوہرانہ حیثیت تو خیر واہیات ہے البتہ ایڈیٹرانہ حیثیت ہی صرف ہماری واحد حیثیت ہے۔

ڈائرکٹر صاحب اور بیگم صاحبہ کے اس اختلاف خیال کے بعد ہم خود اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ حیثیتیں دونوں اپنی اپنی جگہ پر اہمیت رکھتی ہیں اور کسی ایک سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ ایڈیٹری حیلۂ روزی ہے اور بیوی بہانۂ موت۔ اب یہ سمجھیئے کہ اگر روزی اور موت دونوں ایک دوسرے

کے دونوں بدستور برحق ہیں تو ایڈیٹرانہ حیثیت اور شوہرانہ حیثیت کا اجتماع ضدین بھی انگیز کرنا ہی پڑے گا۔ اور دونوں کی اہمیت کا ایک ہی سانس میں اعتراف کرتے ہی بن پڑے گا۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کو ایڈیٹرانہ اہمیت کیونکر سمجھائی جائے خیر وہ تو عورت ذات ہیں ان کا کیا سوال۔ جب ڈائرکٹر صاحب کا ایسا جہاں دیدہ سر ہماری شوہرانہ حیثیت کو سمجھنے سے قاصر ہے اور ان دونوں کی ناسمجھی نے اس خاکسار میں ابتدائے شوہر لغایت ایڈیٹر کو عجیب دو عملی میں مبتلا کر رکھا ہے اور روز بروز اب تو یہی خیال دماغ میں جڑ پکڑتا جاتا ہے کہ خدا جس کو ایڈیٹر بنانے والا ہو اس کو اپنی قدرت کاملہ کے صدقہ میں شوہر نہ بنائے اور اگر شوہر بنانا ہی مشیت ایزدی ہو تو اس شوہر کو خواہ کچھ بنا دے۔ ایڈیٹر نہ بنائے مگر ایک سوال یہ ہے کہ اگر یہ دعا مقبول ہو گئی تو آیندہ نسلوں کے کام آئے گی ہم آخر کیا کریں۔ جو بیک وقت شوہر بھی ہیں اور ایڈیٹر بھی۔

اخبار کا دفتر ایڈیٹر بن کر بیٹھنے کی جگہ تو ضرور ہوتا ہے، مگر ایڈیٹری کرنے کی جگہ قطعاً نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ وہاں تو صبح سے شام تک ایڈیٹر صاحب سے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے جو قدم بوسی، اذیت کوشی۔ اور دماغ نوشی کے لئے برابر آتے جاتے رہتے ہیں۔ کوئی صاحب محض شرف نیاز حاصل کرنے کے لئے چلے آئے کسی صاحب کے گھر میں لڑائی ہوئی تو غم غلط کرنے کے لئے ایڈیٹر صاحب پر نازل ہو گئے کسی صاحب کو کسی لیڈر کی کوئی بات بری معلوم ہوئی تو ایڈیٹر سے باز پرس کرنے کے لئے آموجود ہوئے۔ کوئی صاحب جنرل فرینکو سے ناراض ہو کر ایڈیٹر کو ڈانٹنے آ رہے ہیں۔ تو کوئی کسی ملکی تحریک سے بد عقیدہ ہو کر ایڈیٹر

کو چیلنج دینے کے لئے آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اخبار کا دفتر اور دفتر میں بھی ایڈیٹر کا کمرہ تو گویا "خانۂ انوری" ہوتا ہے کہ ہر بلا جو آسمان سے نازل ہوتی ہے اس کا پتہ پوچھتی ہے۔ لہذا ضرورت اس کی ہے کہ ادارت کے تمام فرائض تو گھر کے کسی خاموش گوشے میں بیٹھ کر انجام دیئے جائیں۔ اور دفتر میں محض ایڈیٹر بن کر بیٹھا جائے، ڈائرکٹر صاحب بھی یہی چاہتے ہیں اور خود ہمارا خیال بھی یہی ہے۔ مگر گھر پر حال یہ ہے کہ دن بھر کے بعد جب ہم دفتر سے گھر پہنچتے ہیں تو بیگم صاحبہ ہمارے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ سمجھتی ہیں اور سیاسیات میں الجھے اور تھکے ہوئے دماغ کو گھریلو معاملات اور خاندانی مناقشات سے تازہ کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ہم تو بیٹھے کاغذ قلم دوات لے کر تحریک وحدت العرب پر ایک زبردست لیڈنگ آرٹیکل لکھنے اور انھوں نے بکمال محبت تشریف لاکر فرمایا۔ "کیا اس وقت بھی کچھ لکھنا ہے؟" ہم نے ان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اخبار کے صفحات میں منہ چھپا کر کہا "ہوں" مگر چونکہ ان کو اس "ہوں" سے اطمینان نہیں ہو سکتا تھا، لہذا ازردے کر دریافت کیا۔ "بھائی جان کو کوئی خط لکھیے گا" "میرا سلام بھی لکھ دیجئے گا اور سلمان کو بھی پوچھ دیجئے گا ———" ہم نے ٹالنے کے لئے کہہ دیا "اچھا لکھ دیا جائے گا۔"

بیگم نے اس خیال سے کہ شاید وحدۃ العرب پر بھائی جان کو خط لکھتے ہوئے سلمان کو پوچھنا نہ بھول جائیں۔ مزید تاکید کرتے ہوئے کہا "دیکھئے ان کا خط آئے ہوئے عرصہ ہو چکا ہے، بے حد خفا ہوں گے اور خفگی کی بات بھی ہے۔ اب آخر ان کا ہے کون جو کچھ بھی ہیں آپ ہی ہیں۔ اور آپ کا

یہ حال ہے کہ کمبخت دفتر سر اٹھانے کی مہلت نہیں دیتا۔ ایسی بھی کیا نوکری کہ آدمی دنیا کے کام ہی کا نہ رہے بس اسی کا ہو کر رہ جائے ——"

بیگم کے ان الفاظ کی آواز تو بے شک کان میں جا رہی تھی مگر معنی اور مفہوم سمجھنے کے لئے دماغ کا جو حصہ مخصوص ہوتا ہے اس میں ایران۔ افغانستان ترکستان۔ عراق۔ اور البانیہ بسے ہوئے تھے۔ لہٰذا ہم نے یکایک چونک کہا، "متحدہ محاذ کی ضرورت ہے"۔ بیگم نے حیرت سے کہا "کس چیز کی ضرورت ہے" ہم نے اپنے ہوش میں آکر کہا۔ "ایں کیا کہا؟" بیگم نے ہنس کر کہا "اے واہ—— خود ہی کچھ کہا اور خود ہی سوال کر رہے ہیں۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ بھائی جان کو خط ضرور لکھ دیجئے گا اور اس میں یہ بھی لکھ دیجئے گا کہ باجی نے جس فراک کی پیمائش دی تھی وہ درزی نے کھو دی۔ اب شہر بانو کی ناپ پھر سے بھیج دیں تو اچھا ہے۔ اور ہاں یہ بھی لکھئے گا کہ قوام پہنچا یا نہیں——"

وہ خط کا مضمون بتاتی رہیں اور یہاں ہم اخبار پڑھتے پڑھتے ان کی طرف سے غافل ہو کر طہران اور استنبول پہنچ گئے، اللہ جانے انھوں نے کیا کیا کہا ہوگا۔ کہ یکایک ان کے آخری الفاظ "میل جول رکھنے سے میل جول ہوتا ہے" دماغ میں اس طرح گونجے کہ ہم نے بھی الفاظ کی پوری قوت کے ساتھ کہا "بے شک اتاترک اور رضا شاہ پہلوی کو اس وقت بیدار ہونا چاہیئے"

بیگم منہ کھول کر رہ گئیں اور ہم نے ان کو دیکھ کر اپنی اس گمشدگی اور از خود رفتگی کا احساس کرتے ہوئے ہنس کر کہا "نہیں سمجھیں —— میرا مطلب یہ ہے کہ میں اخبار کا کام کر رہا ہوں اور آپ ہیں کہ خدا جانے کیا ارشاد

فرمائے جاتی ہیں۔"

بیگم نے جل کر کہا۔ "چولہے میں گیا اخبار، ہر وقت اخبار۔ اخبار نہ ہوا جان کا عذاب ہو گیا۔ اب اخبار ہی اوڑھا اور اخبار ہی بچھایا کیجیے۔" ہم نے گھر میں پھوٹ پڑتے ہوئے دیکھ کر وحدۃ العرب کے مسئلہ کو تھوڑی دیر کے لئے ملتوی کر دیا۔ اور بیگم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "سنئے تو سہی میرے خیال میں آپ نے آج تک یہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ میں ایک ایڈیٹر ہوں اور ایک ایڈیٹر ہر وقت ایڈیٹر ہوتا ہے خصوصاً ایسے وقت تو وہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا جبکہ اس کے دماغ میں کوئی مقالہ افتتاحیہ کروٹیں لے رہا ہو چنانچہ میں اس وقت ایڈیٹوریل لکھنے والا ہوں دماغ میں وہی خیالات بھرے ہوئے ہیں۔ اور آپ خدا جانے کیا فرما رہی ہیں۔ میں ذرا یہ مضمون لکھ لوں تو بسر و چشم تعمیل حکم کروں گا۔" بیگم نے سمجھنے کی کوشش کرتے سے گویا صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ "میں یہ پوچھتی ہوں کہ جب گھر پہ بھی آپ کو کام کرنا پڑتا ہے تو آخر دفتر کی حاضری کیوں ضروری ہے، اور اگر دفتر کی حاضری ضروری ہے تو گھر پہ آخر آپ کیوں کام کرتے ہیں، کیا آپ چوبیس گھنٹے کے ملازم ہیں اور گھر والوں کا کوئی حق ہی آپ پر نہیں ہے کہ دو گھڑی گھریلو معاملات پر بھی کوئی بات چیت ہو سکے۔" ہم نے کہا۔ "بیگم یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دفتر میں آنے جانے والوں کا اس قدر ہجوم رہتا ہے کہ وہاں یکسوئی کے ساتھ کچھ لکھا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا وہاں تو صرف لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں اور معمولی کام انجام پاتے ہیں۔ مگر ایڈیٹوریل نہایت اہم چیز ہوتا ہے اور اس کو لکھنے کے

لئے پوری یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ یہ اہم کام گھر کے لئے اٹھا لاتا ہوں غالباً آپ سمجھ گئی ہوں گی۔" بیگم نے کہا "سمجھ تو گئی مگر صحت بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ آخر دماغ کو بھی کسی وقت آرام کی ضرورت ہے یا نہیں۔" ہم نے کہا، "ضرورت تو ہے مگر اس وقت آپ لکھ لینے دیں۔ اس کے بعد میں بھی یکسوئی کے ساتھ تبادلۂ خیالات ہو جائے گا۔" بیگم صاحبہ نے ہمارا رخ لکھنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "اچھا آپ لکھ لیجئے مگر روز روز کا یہ جھگڑا ٹھیک نہیں ہے۔"

بیگم صاحبہ تو خیر کہہ کر چلی گئیں، اور ہم نے موقع غنیمت جان کر جلدی جلدی لکھنا شروع کر دیا۔ لیکن ابھی تمہیدی فقرے بھی ختم نہ ہونے پائے تھے کہ بڑے صاحبزادے اپنا کوک کا موٹر لئے ہوئے تشریف لائے، اور اس میں کوک بھر کر ہمارے کانوں کے پاس جو اس کو چھوڑا ہے تو معلوم یہ ہوا کہ حکومت ترکیہ کا کوئی ہوائی جہاز عین ہمارے کان کے اندر گر پڑا ہے، ہم یکایک چونک پڑے اور ہمارے اس چونکنے پر صاحبزادے کو ایسی تفریح ہوئی کہ وہ قہقہہ بلند کرتے ہوئے ہماری گود میں آگرے۔ اور اس وقت ہماری سمجھ میں آیا کہ ہم دول اسلامیہ کے متحدہ محاذ پر نہیں بلکہ غریب خانہ میں ہیں۔ اور یہ جو کچھ واقعہ ہوا ہے وہ میدان جنگ میں نہیں بلکہ گھر ہی پر بندہ زادہ کے ہاتھوں ہوا ہے لہٰذا اس کو ڈانٹ کر کہا۔ "کیا کرتے ہو، یہ کیا شرارت ہے؟" صاحبزادے نے کہا: "آپ سمجھے ہوں گے کہ ریل گاڑی کان میں گھس گئی۔" ہم نے بدستور غصہ میں کہا۔ "جاؤ یہاں سے نہیں تو ہم کان لیتے ہیں تمہارے، بیوقوف کہیں کا" ـــــ صاحبزادے نے وحدۃ العرب کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہوئے مچل کر کہا۔ "پیسہ دیجئے۔" ایسے

ضدی بچوں سے خدا بچائے، اب بتلائیے کہ اس وقت ہمارا کیا حال ہوگا۔ جی چاہتا تھا کہ ان صاحبزادہ کو سر سے اونچا اٹھا کر دے ماریں، یا خود اپنی بوٹیاں نوچیں، غصہ میں جلبلا کر ہم نے قلم تو رکھ دیا۔ اور اٹھ کر صاحبزادہ کا کان جو پکڑتے ہیں تو انھوں نے اپنے دہانے کو پوری وسعت کے ساتھ کھول کر وہ فلک شگاف نعرۂ احتجاج بلند کیا ہے کہ مسئلہ وحدۃ العرب تو خیر دماغ سے نکل ہی گیا مگر بیگم صاحبہ کے خلاف جو محاذ اتفاقی طور پر طیار ہو گیا تھا اس نے دماغ کو اور بھی پریشان کر دیا۔ کہ اب اگر وہ آگئیں تو کیا جواب دیں گے۔ چنانچہ جو خطرہ تھا پورا ہوا۔ یعنی صاحبزادہ کی آواز سن کر وہ آموجود ہوئیں۔ اور آتے ہی ہم سے پوچھا "یہ کیوں رویا؟" ـــــ ہم نے کہا: "اس سے پوچھیے کہ اس کو کس نے رُلایا ہے؟" بیگم نے بغیر اس سے پوچھے ہوئے ہم سے کہا کہ "اس سے کیا پوچھوں، آخر آپ بتاتے کیوں نہیں؟"

ہم نے ایک اقراری مجرم کی طرح کہا اس نے خود ہی ضد کی اور خود ہی مچل گیا۔ اب جو میں نے پیار کرنے کے لئے اٹھایا تو لگا رونے۔ صاحبزادے نے حلق پھاڑ کر کہا۔ "پیار کب کیا تھا۔ ہمارے کان پکڑ کر مروڑ دیئے۔" بیگم نے ہماری صورت دیکھی تو ہم کو ہنسی آگئی، بیگم نے اس کو اعتراف جرم سمجھتے ہوئے کہا، "کیا اچھے معلوم ہوتے ہیں آپ کہ بچوں سے لڑتے ہیں اب آپ ہی اس کو منائیے۔" ـــــ ہم نے اپنے ایڈیٹوریل کی طرف سے صبر کرتے ہوئے کہا۔ "منا تو دیتے ہیں، یہ لکھنے بھی تو نہیں دیتا۔"

بیگم نے کہا۔ "ہاں تو آخر کب تک لکھنے دے، دن بھر آپ کو دیکھتا نہیں

اور اس وقت بھی آپ آتے ہیں تو کونے میں منہ ڈالے ہوئے لکھ رہے ہیں، آخر ان کا بھی کچھ حق ہے۔" ــــ ہم نے کہا کہ "بہتر ہے اس حق کو جس طرح کہیے ادا کردوں۔" صاحبزادے نے خود ہی کہا "ہم کو گھمانے چلئے گا، نہیں تو ہم سے دوستی نہیں ہو سکتی۔" ہم نے ایڈیٹوریل کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "چلو بازار چلیں۔" اب آپ ہی بتائیے کہ اس وقت تو ایڈیٹوریل یوں رہ گیا اور بیوی بچوں کی نذر ہو گیا۔ دوسرے دن جو دفتر پہنچے تو حسب معمول ملنے والوں کا ہجوم پایا۔ اب جو ایڈیٹوریل کو مکمل کرنے کے لئے چپراسی سے کہا کہ کسی کو کمرہ میں نہ آنے دو۔ تو ڈائرکٹر صاحب نے حیرت سے پوچھا "کیا آج گھر پر ایڈیٹوریل نہیں لکھا تھا؟"

ہم نے کہا "کیا بتائیں صاحب، خانگی جھگڑے، بیوی، بچوں کے قصے مہلت ہی نہیں دیتے۔" ڈائرکٹر صاحب نے ان جھگڑوں کو معمولی سمجھتے ہوئے کہا "آپ بھی ان گھریلو باتوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہ سب قصے تو ہوا ہی کرتے ہیں۔"

ہم جلے ہوئے تو تھے ہی، لہٰذا ان سے ترکی بہ ترکی کہا "خدا کرے آپ کی شادی ہو اور ان جھگڑوں سے آپ کو پالا پڑے۔"

ڈائرکٹر صاحب نے کہا "شادی کیا پھر سے ہوگی، شادی تو ہو چکی ہے۔ اور بیوی بھی وطن میں ہیں۔ مگر یہ جھگڑے وگڑے کچھ نہیں ہیں۔" ہم نے کہا "ہاں تو ملاح در چین کشتی در فرنگ، جھگڑا کیا خاک ہو۔" ڈائرکٹر صاحب نے کہا "تو آپ بھی میری پیروی کریں۔ اور بال بچوں کو وطن پہنچا دیں نا۔"

اب بتائیے کہ اگر یہ مشورہ بیگم سن پائیں تو کیا ہماری ایڈیٹری) اور یہ ملازمت رہ سکتی ہے، وہ فاقہ کشی کر لیں گی۔ مگر یہ نوکری نہ کرنے دیں گی۔ جس میں بیوی کو وطن میں رکھنے کے مشورے دیئے جاتے ہوں۔

شہتوت

گھر میں شہتوت کا درخت ہے اور شہتوت مولوی صاحب کی دُکھتی ہوئی رگ — لڑکوں کو تو آپ جانتے ہیں کہ شرارت کا ایک بہانہ ملنا چاہیے اور جب کوئی بوڑھا ہی دیوانہ بن جائے تو ان شیطانی لشکر کے رضا کاروں کو بہانہ ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی، چنانچہ یہی ہوتا ہے کہ مولوی صاحب تشریف تو لاتے ہیں لڑکوں کو پڑھانے کے لیے مگر اپنے ساتھ ایک ہنگامہ شہتوت لے کر تشریف لاتے ہیں، جو نہایت معمولی طریقہ پر شروع ہو کر رفتہ رفتہ اچھا خاصا بلوہ بن جاتا ہے، اور ایسی خوفناک صورت اختیار کر لیتا ہے کہ مولوی صاحب اپنا تمام تقدّس اور بزرگی بالائے طاق رکھ کر قابل دست اندازی پولیس بن جاتے ہیں اور لڑکوں کا یہ خلاف قانون مجمع ”شہتوت شہتوت“ کے نعرے بلند کر کے واقعی لاٹھی چارج کا مستحق ہو جاتا ہے، یوں مولوی صاحب کو دیکھیے تو نہایت مردِ معقول نظر آتے ہیں — سر کے پٹوں سے متانت کی تخلیق ہوتی ہے آنکھوں کے سرمے سے سنجیدگی کی لہر پیدا ہوتی ہے، ڈاڑھی تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بزرگی کی علامت ہے اور ان سب پر طرّہ یہ ہے کہ جب کوئی شوہر اپنی بیوی کی ساری کا صافہ باندھ لیتا ہے تو یوں بھی بھاری بھرکم ہو جاتا ہے اور اگر اپنے ساتھ لٹھ بھی رکھے تو رعب بھی شامل حال رہتا ہے۔ المختصر یہ کہ اگر شہتوت کو نظر انداز

کر دیا جائے تو مولوی صاحب ہر اعتبار سے نہایت معقول نظر آتے ہیں مگر خدا جانے دماغ کا کون سا پرزہ ڈھیلا ہے کہ شہتوت کا نام لیتے ہی معلوم یہ ہوتا ہے کہ کسی نے بارود کے ذخیرہ میں دیا سلائی لگا دی۔ یعنی مولوی صاحب انسانی صورت کے گھن چکر بن کر رہ جاتے ہیں، اور پھر قابو میں نہیں آتے۔

ہوتا یہ ہے کہ آپ نے آکر آواز دی اور سب لڑکے اپنا اپنا جزدان، رحل اور تختی بغل میں دبا کر نہایت سعادتمندی کے ساتھ ان کے پاس پہنچ گئے، اور ادب سے سلام کر کے ان کے سامنے بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب بھی بکمال سنجیدگی پڑھانے کے لئے بیٹھے، اور شروع کر دیا پڑھانا۔ اب لڑکوں نے مولوی صاحب سے نظر بچا کر ایک دوسرے کو اشارہ کیا، اور اشاروں ہی اشاروں میں کچھ طے کر کے ایک لڑکے نے کہا "مولوی صاحب فارسی میں اس کو کیا کہتے ہیں؟"

مولوی صاحب نے چشمہ کے اندر سے گھور کر کہا۔ "کس کو کیا کہتے ہیں؟"

لڑکوں نے کہا۔ "اس کو جس کا نام لینے پر آپ خفا ہوتے ہیں۔"

مولوی صاحب نے کہا۔ "دیکھو کل میں نے خوب اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ میں نہ نوکری کی پرواہ کرتا ہوں اور نہ کسی سے ڈرتا ہوں۔ اگر تم لوگوں نے اس گستاخی کا سلسلہ جاری رکھا تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ ایک آدھ کی موت میرے ہاتھوں آئے گی اور میں پھانسی پر چڑھ جاؤں گا۔ مگر تم لوگ نہیں مانتے ہو۔"

لڑکے نے کہا۔ "مولوی صاحب اسی لئے تو میں نے نام نہیں لیا ہے۔ لیکن اگر کوئی اس نامعقول چیز کا نام فارسی میں پوچھ بیٹھے تو میں کیا جواب دوں گا؟"

مولوی صاحب نے کہا۔ "بس تم یہی کہ دینا کہ اس کو فارسی میں لغویت

کہتے ہیں۔ اول تو کوئی معقول آدمی ایسا نامعقول سوال ہی نہ کرے گا۔ اور اگر پوچھے تو تم صرف لغویت کہنا، اس لئے کہ فارسی زبان ایسی غیر مہذب نہیں ہے کہ اس میں ان نامعقول چیزوں کے نام بھی ہوں۔"

لڑکے نے کہا، "تو مولوی صاحب شجر لغویت کے معنے ہوئے شہتوت کا درخت!"

اب مولوی صاحب بجلی کی طرح تڑپ کر اٹھے، اور اپنا ڈنڈا دیوانہ وار اٹھایا، ادھر ان کا یہ چھوٹا سا مکتب درہم برہم ہو گیا، سوال کرنے والا لڑکا تو خیر بھاگ گیا، مگر دوسرے لڑکوں کو بھی اپنی زندگی خطرہ میں نظر آئی اور وہ بھی مولوی صاحب اور ان کے لٹھ کی پہنچ سے دور ہٹ گئے، خود مولوی صاحب آتش زیر پا۔ کف در دہاں۔ لٹھ بدست عجیب آسیب زدہ صورت بنائے ہوئے لگے کہنے، "جس گھر میں یہ نامعقول درخت ہو اس میں رحمت کے فرشتے نہیں آسکتے، کبھی برکت نہیں ہو سکتی۔ جو مصیبت اس گھر پہ نازل ہو کم ہے جس گھر میں ایسے شجر ممنوعہ کو نشو ونما دی جاتی ہو وہاں کے لڑکے ایسے ہی نالائق ہو سکتے ہیں۔ نہ ان کو علم آئے گا، نہ ادب، نہ یہ لکھ سکیں گے، نہ یہ پڑھ سکیں گے۔ بس بھیک مانگیں گے در در کی، اور بھیک بھی ان نامرادوں کو نہ ملے گی۔" کسی لڑکے نے زور سے کہا۔ "مولوی صاحب دیکھئے میں تو شہتوت نہیں کہتا۔"

مولوی صاحب نے اپنا لٹھ اس کی طرف دے مارا۔ اور حلق پھاڑ کر بولے "نہیں کہتا کا بچہ۔ اور یہ تو نے کہا کیا ہے؟" لڑکے کھل کھلا کر ہنستے ہوئے بھاگے اور مولوی صاحب نے پھر بڑبڑانا شروع کیا۔ "خدا ایسی اولاد کسی کو نہ دے یہ نالائق

خاندان کا نام ڈبوئیں گے اور ننگِ اسلاف کہلائیں گے۔ ان کے یہ کرتوت ان کو دنیا اور عقبیٰ دونوں میں ذلیل کریں گے۔"

ایک لڑکے نے کہا: "مولوی صاحب کرتوت نہیں شہتوت کہئے شہتوت۔"

مولوی صاحب دیوانہ وار اس کی طرف جھپٹے اور اس جھپٹ میں ناکام رہ کر آپ نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اور لٹھ دھڑا دھڑ زمین پر پٹکنے لگے۔ مختصر یہ کہ اگر کوئی بڑا بوڑھا آگیا اور اس نے لڑکوں کو ڈانٹ کر مولوی صاحب کو سمجھا دیا تو خیر ورنہ مولوی صاحب اسی عالم میں گھر چلے جاتے ہیں۔ اور لڑکوں کو حسب دلخواہ بحسن و خوبی چھٹی مل جاتی ہے۔

ایک دن یہ تمام قصہ بیگم نے ہم کو سنا کر کہا کہ آخر مولوی صاحب پڑھانے کے لئے رکھے گئے ہیں یا اس لئے کہ یہ لڑکے ان کو اس طرح چٹکیوں میں اڑایا اور انگلیوں پر نچایا کریں۔ لڑکے تو خیر لڑکے ہیں۔ مگر ان بڑے میاں کو کیا ہو گیا ہے۔ ذرا ایک دن آپ بھی یہ تماشہ دیکھ کر مولوی صاحب کو سمجھایئے تو سہی۔ مولوی صاحب کے یہ حالات سن کر خود ہم کو ان سے بےحد دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اور ایک روز ہم نے یہ تمام ہنگامہ چھپ کر دیکھا اور جب اس تماشہ کو خوب اچھی طرح دیکھ چکے تو سامنے آکر پہلے تو لڑکوں کو خوب ڈانٹا اس کے بعد مولوی صاحب کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "مولانا آخر یہ قصہ کیا ہے، آپ کا ایسا سنجیدہ اور فہمیدہ بزرگ اور اس کا یہ عالم کہ ٹانگ برابر کے چھوکروں پر قابو حاصل نہیں۔"

مولوی صاحب نے اپنی وحشت کو دباتے اور مصنوعی طور پر انسان بنتے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "صاحب بہت اچھا ہوا کہ آج آپ نے خود ان

صاحبزادوں کی یہ حرکتیں دیکھ لیں۔ میرا تو ناک میں دم ہو چکا ہے اور میں خود یہ چاہتا ہوں کہ اب آپ سے رخصت حاصل کر لوں۔ میں دراصل لڑکوں کو نہیں پڑھا سکتا۔"

ہم نے سب کچھ جانتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "آخر کچھ معلوم تو ہو کہ واقعہ کیا ہے؟"

مولوی صاحب نے کہا: "صاحب یہ لڑکے سخت نالائق ہیں۔"

ہم نے کہا: "مولوی صاحب یہ تو آپ محبت فرماتے ہیں اور دراصل یہ آپ ہی کا فیضان ہے، ورنہ یہ لڑکے کس قابل ہیں۔"

مولوی صاحب نے بغیر سمجھے بوجھے جوش میں کہا: "آپ لوگ قطعاً ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اور یہ اس حد تک بگڑ چکے ہیں کہ اب اصلاح ناممکن ہے۔"

ہم نے کہا: "پھر بھی آخر آپ یہ تو فرمائیں کہ شکایت کیا پیدا ہوئی؟"

مولوی صاحب نے کہا: "قصہ دراصل یہ ہے کہ یہ لڑکے اس ناپاک درخت کی صحبت میں خراب ہو رہے ہیں۔"

ہم نے کہا: "کونسا نالائق درخت مولانا؟"

مولوی صاحب نے کہا: "اجی وہی نامعقول درخت جس میں وہ لغویت پیدا ہوتی ہے۔"

ہم نے غور کرنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "میں قطعاً نہیں سمجھا۔"

مولوی صاحب نے کہا: "آپ کا دماغ پاکیزہ ہے، اس میں اس گندی چیز کا نام قیامت تک نہیں آسکتا۔"

ہم نے کہا: "یہ چنبیلی کا درخت ہے، یہ گلاب ہے، یہ گل عباس ہے، یہ کروٹن ہے، یہ نیبو ہے، یہ ہزارہ نارنگی ہے۔ یہ امرود ہے۔ یہ شہتوت ہے......"

آخری نام پر مولانا نے بڑی زور سے "آخ تھو" کہا اور چہرہ پر ذرا تنفر کی کیفیت پیدا کر لی۔ تو ہم نے کہا، "غالباً آپ کی مراد شہتوت سے ہے؟"

مولانا نے پھر تھوکتے ہوئے نہایت تنفر سے کہا، "آپ کیوں اپنی زبان خراب کر رہے ہیں، اس زبان سے آپ خدا کا نام لیتے ہوں گے۔"

ہم نے کہا: "مگر مولانا میرے نزدیک تو شہتوت خدا کی بھیجی ہوئی نعمتوں میں سے ایک ہے اور اس سے اظہار تنفر کرنا کفران نعمت ہے؟"

مولانا نے کہا، "معاف کیجئے گا، میری رائے یہ تھی کہ آپ نہایت قابل آدمی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ آپ کو نفاست پسند بھی سمجھتا تھا۔ مگر آج معلوم ہوا کہ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں ورنہ آپ کے دماغ میں یہ گمراہ کن اور ناپاک خیال پیدا ہی نہ ہوتا۔ اور آپ کی زبان سے اس ناپاک چیز کا ذکر ہی کوئی نہ سنتا۔"

ہم نے اپنے کو سنجیدہ بنائے رکھا۔ اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "دراصل مولانا میں بالکل نہیں سمجھ رہا ہوں کہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ میں آپ سے تبادلہ خیال کرنا چاہتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ آپ مجھ کو بھی اپنا ہمخیال بنالیں۔"

مولوی صاحب نے قرآت کے ساتھ کہا، "جزاک اللہ۔ اگر آپ واقعی یہ چاہتے ہیں تو سب سے پہلے یہ کام کیجئے کہ اس درخت کو آج ہی کٹوا دیجئے، ورنہ آپ کے گھر پر ہمیشہ ادبار کی گھٹائیں چھائی رہیں گی۔ اور کبھی فلاح و بہبود کی صورت پیدا نہ ہوگی۔"

ہم نے کہا۔ "مولانا یہی تو میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ آخر شہتوت کی وجہ سے یہ تمام باتیں کیونکر ممکن ہیں۔"

مولوی صاحب نے پھر تھوکتے ہوئے کہا۔ "اس چیز کا نام آپ زبان سے نہ لیں۔ دراصل اس کی وجہ سے آج بنی نوع انسان اس دنیا میں پڑے ہوتے ہیں ورنہ جنّت میں نہ ہوتے۔"

ہم نے کہا۔ "مگر مولانا ہم نے تو سنا ہے کہ گیہوں کی وجہ سے حضرت آدمؑ جنّت سے نکالے گئے تھے۔"

مولوی صاحب نے کہا۔ "یہ ایک غلط فہمی ہے۔ اور ایک وسیع قسم کی تاریخی غلطی ہے۔ دراصل شجرِ ممنوعہ سے مراد یہی نامراد درخت ہے۔ گیہوں نہیں۔ صورت دیکھیے اس کمبخت کی تو کھجلی ہونے لگے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ گویا کملا چڑھنے کے لئے رینگتا ہوا چلا آتا ہے۔ دراصل یہ ایک قسم کا نباتاتی سونڈا ہے۔ لاحول ولا قوۃ اور کفار ہیں کہ اس کو کھاتے ہیں۔ استغفراللہ۔"

ہم نے کہا۔ "مولانا صورتاً تو آپ نے تشبیہ بالکل صحیح دی۔ کہ یہ کملا یا نباتاتی سونڈا ہے مگر اس کا لطیف مزا..."

مولانا نے بات کاٹ کر کہا۔ "لاحول بھیجیے اس شیطان کی مرغوب ترین ترکاری پر اور یاد رکھئے کہ یہ مہمل چیز ہمیشہ تاریخی طور پر تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔ اس نے بھرے گھر اجاڑے ہیں اور دنیا اور عقبیٰ دونوں کا ستیاناس مارا ہے۔"

مولوی صاحب کی یہ گفتگو یقیناً دلچسپ تھی اور اس پوری دلچسپی نہ لینا انتہائی بدمذاقی ہوتی۔ لہٰذا ہم نے کہا۔ "مولانا تاریخی اعتبار سے شہتوت تباہ کن ثابت ہوا ہے

یہ تو میں بالکل نہیں سمجھا۔ حالانکہ تاریخ میرا محبوب ترین مضمون ہے؟"

مولوی صاحب نے لجاجت سے کہا۔ "للہ اس نابکار شے کا نام نہ لیجئے آپ کے چہرہ کا نور اڑتا جاتا ہے اور ایک خوفناک سیاہی آپ کے رخ روشن پر پھیلتی ہوئی میں دیکھ رہا ہوں۔ تعجب ہے کہ آپ کو تاریخ کا ذوق ہے اور آپ نے اس کمبخت کی تباہ کاریوں پر کبھی غور نہ کیا۔ محمد شاہ رنگیلا اس سے شوق رکھتا تھا اور نادر شاہ درانی اس سے نفرت کرتا تھا، پھر دیکھئے کیا نتیجہ ہوا۔ نادر شاہ کو بھی چپکے سے یہی چیز کھلا دی گئی تھی۔ تو اس کے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ اور وہ درد عارضی طور پر گلقند کے ایک مرتبان سے جاتا تو رہا مگر دراصل اس کی موت محض اسی ظالم کی وجہ سے ہوئی۔ اور سنئے سلطنت مغلیہ کے زوال کا باعث یہی کمبخت ہوا جبکہ جودھا بائی کے لگائے ہوئے باغ میں دکن کا ایک درخت پروان چڑھا۔ اور مغل خاندان نے اس درخت کے اس لعنتی پھل کو کھایا۔ چھی۔ چھی۔ چھی۔ اس کو کھاتے ہی اس سلطنت کے قدم ڈگمگا گئے، اور آخر کار دیکھ لیجئے کہ جس حکومت کے ڈنکے بج رہے تھے آج اس کا کوئی نام لیوا بھی نہیں ہے، سلطان ترکی نے اس نابکار چیز کو استعمال کیا۔ ترکوں کو اس کی خبر ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو معزول کر دیا گیا۔ اور غازی کمال اتاترک جو اس چیز کا انتہائی دشمن ہے برسر حکومت آیا اور دیکھ لیجئے کہ کیسی ترقیاں کر رہا ہے۔ خود انگریزوں کو دیکھ لیجئے کہ ان کی حکومت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ کیا ہے دراصل اور کوئی بات نہیں ہے صرف وہ اتنی احتیاط برتتے ہیں کہ اس چیز کو اپنے لئے زہر سمجھتے ہیں اور آج تک کسی انگریز نے اس کو بھول کر بھی نہیں کھایا۔ تعجب ہے کہ آپ کو یہ باتیں نہیں معلوم۔ میں تو یہ

کہتا ہوں کہ اگر آپ کے گھر میں کوئی انگریز آجائے تو محض اس درخت کو دیکھ کر آپ کے لئے نہایت بری رائے قائم کرنے۔ اور پھر آپ اس کو کسی طرح خوش نہیں کر سکتے۔

مولوی صاحب کی اس تاریخی بکواس سے الجھ کر ہم نے کہا۔ "مولانا یہ سب لغویت ہے۔"

مولوی صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔ "اگر آپ لغویت سمجھتے ہیں تو آج ہی اس گردن زدنی کو کٹوا کر اپنا گھر اس سے صاف کر لیجئے۔"

ہم نے مولوی صاحب کا دل رکھنے کو کہا۔ "بہتر ہے، یہ شجر ممنوعہ آپ کل سے نہ دیکھیں گے۔"

مولوی صاحب نے اس وعدہ پر اطمینان کی سانس لی اور دل کی گہرائیوں سے کہا۔ "خدا آپ کو جزائے خیر دے، آپ کا ایسا قابل آدمی زیادہ عرصہ تک گمراہ نہیں رہ سکتا تھا۔"

یہ کہہ کر مولوی صاحب جانے لگے۔ مگر ہم نے ان کو چائے پلانے کے لئے روکنا چاہا تو مولوی صاحب نے ایک اور تاریخی بات فرمائی۔ کہ "میں تو چائے پی نہیں سکتا۔ سخت چھینکیں آنے لگتی ہیں۔"

ہم نے چائے پر چھینکوں کی جدّت کو تعجب سے سنا اور بجائے چائے کے مولانا کے لئے شربت لانے کو کہہ دیا۔ اور مولوی صاحب سے پھر سیاسیات شہتوت پر تبادلۂ خیالات کرنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس بیچارے کا دماغ قابل رحم حد تک شہتوت زدہ ہو چکا تھا۔ اور شہتوت کے سلسلہ میں ان کی چڑ گویا اب تصنع کی حدود سے نکل کر دماغی خلل تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ جب وہ تعریفوں کے پل

باندھ کر شربت کا گلاس چڑھا گئے، تو ملازم نے بیگم کا پرچہ ہم کو دیا۔ جس پر صرف یہ لکھا ہوا تھا کہ "یہ شہتوت کا شربت تھا"۔ ہم نے وہ پرچہ مولانا کو دیتے ہوئے کہا "مولانا صاحب دیکھیے آج آپ کا ایمان یوں لوٹا گیا ہے"۔ مولوی صاحب نے پرچہ دیکھتے ہی شربت کا خالی گلاس ملازم پر اس طرح کھینچ کر مارا کہ اگر وہ کرکٹ کا اچھا کھلاڑی نہ ہوتا اور گلاس کو روک نہ لیتا تو خود اس کو تو خیر چوٹ لگتی ہی مگر گلاس کا نقصان اس تمام قصہ کو ٹریجڈی پر ختم کرتا۔ بہرحال مولانا اس وقت جلدی میں صرف یہ کر سکے کہ جلبلاتے ہوئے یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ "میں بے بس تھا مگر خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی"۔

مکھیاں

ہمارے پڑوسی ہیلتھ آفیسر صاحب کو خدا جانے یہ شبہ کیونکر ہو گیا کہ ہم غالب کے طرفدار ہوں یا نہ ہوں مگر سخن فہم ضرور ہیں، چنانچہ ہیضہ کی آمد کے سلسلہ میں آپ کو ایک مجمع عام کے سامنے "مکھی" کے موضوع پر تقریر کرنا تھی، اور آپ چاہتے تھے کہ اس تقریر کی داد ہم سے حاصل کریں، لہذا ہم کو حقِ ہمسائیگی اس طرح ادا کرنا پڑا کہ ان کے ہمراہ "تعزیرات مگس" کے خلاف ایک باغیانہ جلسہ میں شریک ہوتے، اور اس جلسہ میں نہایت غور کے ساتھ مکھی کے اہم موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی ایک فاضلانہ تقریر سنی، ڈاکٹر صاحب کے متعدد احسانات خود ہماری ذات پر تھے، مثلاً یہ کہ وہ ہماری غزلیں سن کر داد دیا کرتے تھے، اور اکثر ہمارے مضامین پڑھ کر خوش ہوا کرتے تھے، لہذا ہم نے بھی اس معاصرانہ تبادلہ کو ضروری سمجھا کہ آج ان کی تقریر سنیں اور جس قدر داد ہم کو وہ دے چکے ہیں اس کا معاوضہ نہایت فراخ دلی کے ساتھ دیں، چنانچہ ہم نے واقعی ان کی تقریر کے ایک ایک لفظ بہت غور سے سنا اور اس کو سمجھنے کی کوشش بھی کی چنانچہ جلسہ کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب نے جب بطور فخر مسکرا کر ایک داد طلب انداز سے ہم کو دیکھا تو ہم نے فوراً کہا "کیا کہنا ہے ڈاکٹر صاحب

کیا معجز بیانی تھی اور کس قدر فصیح و بلیغ تقریر فرمائی ہے"۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے کسر نفسی سے کہا۔ "اجی کیا تقریر تھی"

ہم نے سنجیدگی سے کہا "نہیں صاحب نہایت عمدہ اور نہایت دلچسپ تقریر فرمائی ہے آپ نے کم سے کم اب آپ میرے گھر میں تو کوئی مکھی دیکھیں گے نہیں؟" ڈاکٹر صاحب نے کہا، "خیر یہ تو ناممکن ہے، مگر واقعی احتیاط بہت ضروری ہے، یہ مکھی ہیضہ کی ماں ہوتی ہے۔" ہم نے کہا "خیر یہ تو آپ کو تجربہ سے معلوم ہوگا کہ یہ ممکن ہے یا ناممکن ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ مکھی کے سلسلہ میں آپ کی بدولت بہت کچھ معلوم ہو گیا ورنہ اب تک تو ہم صرف یہی سمجھتے تھے کہ مکھی بھی ہے خیر ایک قسم کا جانور"۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "جانور۔ ارے صاحب جانور نہیں بلکہ شیر سے بھی زیادہ خوفناک درندہ، شیر کو تو آپ خوفناک جانتے ہیں اور اس سے بچنے یا اس پر غالب آنے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ شیر سے زیادہ نقصان غیر محسوس طور پر پہنچا جاتی ہے، اور آپ اس کا کبھی مقابلہ نہیں کرتے ہیں۔"

ہم نے سنجیدگی سے ڈاکٹر صاحب کے الفاظ کی صداقت پر غور کرتے ہوئے کہا۔ "بے شک مکھی شیر سے زیادہ خونخوار درندہ ہے، اب انشاء اللہ شیر کے بجائے اسی کا شکار ہوگا، اور میرے گھر میں یہ درندہ قطعاً اڑتا ہوا آپ نہ دیکھیں گے۔"

ڈاکٹر صاحب کی اس تقریر کو سننے کے بعد ہم نے اپنی توجہ کا مرکز اس مکھی کو بنا لیا جو بظاہر نہایت کم حقیقت کیڑہ مگر دراصل بقول ڈاکٹر صاحب کے

شیر سے بھی زیادہ خوفناک قسم کا درندہ تھی۔ بہرحال ہم نے گھر آکر گھر کے ہر خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ مکھی سے محفوظ رہنے اور مکھی کے خلاف نہایت سرگرم تحریک شروع کرنے کا مشورہ دیا، باورچی خانہ کے دروازہ کو ایک اور دروازہ کا ماتحت بنا دیا جس پر جالی لگائی گئی، اس کے علاوہ کھانے کے کمرہ کا ہر دروازہ جالی دار بنا دیا گیا، اور خاص طور پر ہدایت کر دی گئی کہ اگر کوئی ملازم کھانے پینے کی کوئی چیز ایسی جگہ رکھے گا جہاں مکھیاں پہنچ سکیں تو اس پر جرمانہ ہوگا، اور ہر گاہ کہ وہ مستوجب ہوگا ہماری سخت سے سخت سرزنش کا، کھانے پینے کے علاوہ دیگر چیزوں پر بھی مکھی کا بیٹھنا اچھا نہیں ہے، اور جو ملازم کسی مکھی کو اڑاتا ہوا یا بھگاتا ہوا نظر آئے گا وہ سراحم مالکانہ کا مستحق ہوگا۔ ان تمام انتظامات اور حکایات کے بعد کھانے کے وقت جب ہم جالی دار کھانے کے کمرہ میں پہنچے تو بیگم نے ہنس کر کہا "جہاں انسان ہوں گے وہاں مکھی بھی ضرور ہوگی۔" ہم نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے، انسان ہوں یا نہ ہوں مگر مکھی نہیں رہ سکتی، اب آپ ہی دیکھیے کہ ذرا سی احتیاط برتی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں کوئی مکھی نہیں ہے۔" بیگم نے ہنس کر اور جلا دینے والے انداز میں کہا "وہ دیکھیے آپ کے اس دعوی کی تردید بیٹھی ہوئی ہے۔" ہم نے یکایک دم بخود ہو کر "کہاں ہے، کدھر ہے؟"

بیگم نے مکھی کو شیر سے زیادہ خوفناک درندہ نہیں بلکہ محض مکھی سمجھتے ہوئے کہا "ارے وہ کیا ہے الماری پر" ہم نے ادھر ادھر دیکھا اور قریب ہی سے جوتا اٹھا کر دبے پاؤں الماری کی طرف بڑھے، مگر قبل اس کے کہ

ہم مکھی کے قریب پہنچیں اور وہ ہماری زد پر آئے اس چالاک مکھی نے ہم کو جھکائی دی اور الماری کے ایک پٹ سے اُڑ کر دوسرے پر بیٹھ گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کو اپنا نقشۂ جنگ تبدیل کر دینا پڑا، اور اب ہم اس جھنور کو لے کر دبے پاؤں مکھی سے آنکھ بچا کر ٹھیک اس کی دُم کے قریب آ گئے، اس غافل مکھی کو اس کی قطعاً خبر نہ تھی کہ موت اس کے سر پر سوار ہے، بہرحال ہم نے نشانہ لگا کر جھنور کو تانا اور اب جھنور اس مکھی کے شیرازۂ عناصر کو منتشر کرنے ہی والا تھا کہ اس نے اپنے کو موت کے منہ سے بچا کر پھر پرواز کی اور اب کی وہ اڑ کر کھانے کی میز پر جا بیٹھی مگر اب کی اس ظالم نے یہ ترکیب کی تھی کہ ایک نہایت قیمتی پلیٹ پر اپنا محاذ بنایا تھا جس کے معنی یہ تھے کہ اگر ہم مکھی پر حملہ آور ہوتے تو اس پلیٹ سے بھی ہم کو ہاتھ دھو لینا چاہیے تھا، ہم خود اس نزاکت کو سمجھ رہے تھے کہ بیگم نے شاید ہماری سمجھداری پر شک کرتے ہوئے کہا، "دیکھئے پلیٹ ٹوٹ جائے گی"۔ ہم نے کہا "لاحول ولاقوۃ آپ تو بالکل ہی بے وقوف سمجھتی ہیں، ذرا چپ رہئے، ورنہ مکھی اس سازش کے حالات سُن لے گی، اور بھاگ جائے گی"؟

مکھی نے غالباً اپنے کو اس پلیٹ پر ہر طرح محفوظ سمجھا اور وہاں سے نہ ہلی لہذا خود ہم نے اس کو وہاں سے اڑایا، مگر وہ مکھی اپنے وقت کی کوئی ماہر جنگ جنرل تھی، پلیٹ سے اڑ کر اس نے گلاس پر قدم رنجہ فرمایا، اور ہم کو پھر وہی پالیسی اختیار کرنا پڑی۔ کہ پہلے اس کو گلاس سے ہٹائیں، اس کے بعد حملہ کی طیاریاں کریں چنانچہ اس کو جھنور کی ایک جنبش سے گلاس چھوڑنے پر مجبور کر دیا، مگر اب اُس نے فضا میں دو تین چکر لگانے کے بعد سب سے زیادہ محفوظ مقام بیگم صاحبہ کے

سرِ اقدس کو سمجھا مگر بیگم صاحبہ اس کے بیٹھتے ہی سخت بدحواس ہوئیں کہ مبادا ہم اس موقع کو غنیمت سمجھ کر بیک کرشمہ دو کار نہ کر جائیں کہ مکھی تو ماریں اور سر ان کا بھی پھوٹے، بہرحال وہ اچھل پڑیں اور مکھی کو مجبوراً پھر وہاں سے اڑ کر ایک کرسی پر پناہ لینا پڑی، یہ جگہ حملہ کے لئے نہایت مناسب تھی، لہٰذا ہم نے بکمال احتیاط چنور اٹھایا اور شست باندھ کر جو وار کیا ہے تو مکھی کے قفسِ عنصری کو منہدم کر دیا اور اس کی روح بجائے اس کے پرواز کر گئی مگر یکایک بیگم کے قہقہے سے کھانے کا کمرہ گونج اٹھا، اور ہم نے جو اس بے محل قہقہہ کو سمجھنے کے لئے نظر اٹھائی تو بیگم نے کہا۔ "وہ گئی" ہم نے کہا "کدھر" بیگم نے پھر قہقہہ لگا کر اور ہنسی کے مارے لوٹ کر کہا، "آپ کے سر پر ہے" ہم نے ہاتھ پیر گویا چھوڑتے ہوئے کہا، "میرے سر پر! کھاؤ میرے سر کی قسم" بیگم نے کہا۔ "ارے واقعی آپ کے سر پر ــــــ"

واقعی سخت دیدہ دلیر مکھی تھی یعنی اپنی جان سے بیزار خود قضا کے سر پر کھیل رہی تھی، بجائے اس کے کہ قضا اس کے سر پر کھیلے، بہرحال ہم نے اپنا سر ہلا کر جو اس کو اڑایا تو وہ پھر الماری پر جا بیٹھی۔ اور ہم نے فوراً اس پر وار کیا، مگر بجائے اس کے کہ چنور اس پر پڑتا وہ کمبخت راستہ ہی میں بجلی کے بلب پر پڑا اور ایک دھماکے کے ساتھ بجلی کا بلب ٹوٹ کر گرا، ہم "ارے" کر کے رہ گئے، اور بیگم نے اپنی تیوریوں پر بل ڈالتے ہوئے اس نقصانِ عظیم پر منظور شدہ بجٹ کے اعداد و شمار سامنے رکھ کر ایک دھواں دھار تقریر شروع کر دی، مگر ہماری توجہ بدستور مکھی کی طرف رہی۔ جو ہم کو شکست

دینے کے بعد گلدستہ پر نہایت اطمینان سے بیٹھی ہوئی اپنی پچھلی ٹانگوں سے اپنے پروں کو درست کر رہی تھی، ہم نے اس کو گلدستہ سے اڑایا، اور اب کی مرتبہ کوشش کی کہ اس کی روح عالم پرواز ہی میں پرواز کر جائے مگر وار پھر خالی گیا، اور جنبور براہ راست ایک گلاس پر پڑا، جو ایک دوسری جھنکار کے ساتھ پاش پاش ہو گیا، اب ہم آپ سے کیا عرض کریں کہ ہمارے اشتعال کا کیا عالم تھا، اور ساتھ ہی ساتھ بیگم کا ٹمپریچر مقیاس الحرارت کو عبور کرنے کے قریب قریب تھا، بہرحال اس وقت اگر ہم ان کے غصہ کا خیال کرتے تو اس نابکار مکھی کی حوصلہ افزائی کا اندیشہ تھا، اور پھر مکھیوں کی قوم میں اشرف المخلوقات کی جو مستقل تضحیک ہوتی وہ انسان کو ڈوب مرنے پر مجبور کر دیتی۔ لہٰذا ہم نے اپنے تمام نقصانِ مایہ اور شماتتِ ہمسایہ سے خالی الذہن ہو کر اپنی تمام توجہ اس سرکش مکھی کی جانب مبذول رکھی جو اس وقت نہایت سکون کے ساتھ میز پر بیٹھی تھی اور گویا ہماری تمام طیاریوں پر ہنس ہنس کر مذاق اڑا رہی تھی اور اپنی اگلی ٹانگوں سے "تالیاں بجا بجا کر ونس مور کہہ رہی تھی۔

ہم نے غصہ سے پھر اس پر وار کیا، اور تڑاق سے آواز آئی، مگر ہم نے دیکھا کہ وہ نہایت پرسکون انداز سے اڑ کر بڑے صاحبزادہ کے پلیٹ پر بیٹھ گئی، بیگم نے فوراً صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کہا: "بس ہو چکی ضد، کیا اب بچوں کا بھی سر پھوڑ دیجیے گا؟" ہم نے کہا، سر اگر پھٹے گا تو مرہم پٹی سے ٹھیک ہو جائے گا لیکن اگر ہیضہ ہو گیا تو کیا ہوگا؟" یہ کہہ کر ہم مکھی کو اڑانا چاہتے تھے کہ وہ خود پر پھیلا کر اڑی اور ہم نے بے ساختگی کے ساتھ اس پر حملہ کر دیا، مگر حملہ کے ساتھ

ہی ایک چیخ نے ہم کو حیران کر دیا، دیکھتے کیا ہیں کہ صاحبزادہ صاحب منہ پر ہاتھ رکھے بلک بلک کر رو رہے ہیں، اور ان کی والدہ محترمہ نہایت خونخوار انداز سے ہم کو دیکھ رہی ہیں، ہم نے تھوڑی دیر کے لیئے التوائے جنگ کا ارادہ کر کے چنور رکھ دیا اور صاحبزادہ کو چمکار کر بہلانے کی کوشش کی، مگر وہ ٹھیرے اپنی والدہ کے حقیقی فرزند دلبند، بھلا ہمارے بہلانے سے کیا چپ ہوتے، ان کو تو گویا اس وقت اس خاکسار والد محترم سے زندگی بھر کا انتقام لینے کا موقع ملا تھا، لہذا وہ منہ کھولے ہوئے پنچم میں اپنا راگ الاپتے رہے یہاں تک کہ خود ان کی والدہ نے اٹھ کر گود میں لیا، اور احتجاجاً واک آؤٹ کرنے کے ارادہ سے دروازہ کی طرف بڑھیں اس وقت ہم کو مکھی کا خیال آیا کہ کہیں یہ کمبخت بھی موقع غنیمت جان کر نہ نکل جائے، لہذا ہم ایک جست کر کے دروازہ پر پہنچ گئے، اور بیگم سے کہا کہ دروازہ کا صرف ایک پٹ کھول کر چپکے سے نکل جائیں تاکہ مکھی نہ نکلنے پائے، بیگم نے دوسرے بچہ کو بھی بلایا، اور سب کے سب کمرہ سے نکل گئے، اب اس کمرہ میں ہم تھے اور ہماری یہ حریف مکھی، لہذا ہم نے دروازہ بند کر کے میز پر کی تمام چیزیں پہلے تو ہٹا دیں اس کے بعد چنور سنبھال کر مکھی سے کہا، آج تو نہیں یا ہم نہیں مکھی یہ سن کر ایک کرسی سے دوسری کرسی پر جا بیٹھی، اور اب ہم نے شروع کر دیئے بے تحاشا حملے، کمرہ دھڑا دھڑ کی آواز سے گونجنے لگا اور چنور کے تنکے کمرہ کی فضا میں اڑنے لگے۔ ہم کبھی مکھی کے تعاقب میں میز پر پھاند جاتے تھے اور کبھی میز سے پھاند کر کرسی پر آتے تھے، کبھی الماری پر بمباری کرتے تھے، اور کبھی کسی دیوار پر چاند ماری ہوتی تھی۔ مگر صاحب عجیب سخت جان مکھی تھی

کہ کسی طرح مرنے کا نام ہی نہ لیتی تھی، ہم خود پسینہ پسینہ تھے، اور سانس الگ پھول رہا تھا، معلوم یہ ہوتا تھا کہ اس کمرہ میں کوئی پاگل بند ہے، جو کمرہ کی دنیا کو تہ و بالا کئے دیتا ہے۔ یا ہم یکایک اپنی زندگی کے اس دور میں پہنچ گئے ہیں جب کبڈی کے میچ اس انہماک کے ساتھ ہوا کرتے تھے، مگر ہمارا اشتعال ہم کو مجبور کر رہا تھا کہ ہم ہار نہ مانیں، اور مکھی کو اس کی اس سرکشی کی پوری سزا دیں، ہم نے اس کو الماری پر بیٹھا ہوا دیکھ کر جو وار کیا ہے تو وہ لطیف قسم کا چھناکا ہوا کہ گویا فرنگی ارگن کے ساتوں پردے کسی نے ایک ساتھ کھول دیئے ہیں معلوم ہوا کہ الماری کا شیشہ ٹوٹا ہے، ہم نے کہا "ایں ہم بر سر الم" مگر الماری کے قریب جو گئے تو معلوم ہوا کہ صرف الماری کا شیشہ ہی نہیں ٹوٹا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی الماری میں رکھا ہوا شیشہ کا جگ بھی ٹوٹ گیا ہے، ہم نے کہا ع "ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر!" اس منظر کو دیکھنے کے بعد ہم نے مکھی کے تجسس میں ادھر ادھر نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ آپ خود ہمارے شانے پر تشریف رکھتی ہیں، ہم نے دل ہی دل میں کہا کہ اچھا رہ تو جا، تو بھی کیا یاد کرے گی، کہ کسی سے پالا پڑا تھا۔ اور پھر چپکے سے جنبور چھوڑتے ہوئے خود اپنے شانے پر اس زور سے رسید کیا ہے کہ اگر کوئی اور اس زور سے یہ ضرب شدید پہنچاتا تو شاید ہم اس کی، اور اپنی جان ایک کر دیتے۔ مگر اس کے باوجود مکھی صاف نکل گئی، ہم نے اپنی اس آخری ناکامی پر ایک گھونسا تانا اور ڈھونڈا کہ مکھی اب کہاں ہے، وہ حسب معمول لاپروائی کے ساتھ خود ہماری ناک پر ڈیرہ لگائے ہوئے تھی، ہم نے اس وقت جلدی میں یہ بھی نہ سوچا کہ ناک ہماری

ہے، اور مارنے جو ہیں ایک ہاتھ تو آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا، مگر قبل اس کے کہ ہم غور کرتے ڈاکٹر صاحب نے آواز دی۔ اور ہم ان کی آواز پر غصہ میں کانپتے ہوئے باہر آگئے، ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "چلوگے نہیں؟" ہم نے کہا "کہاں"؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا "ارے بھائی بھول گئے کہ آج کی تقریر کا موضوع "مچھر" ہے۔" ہم نے ڈاکٹر صاحب کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "آپ کی تقریر، آپ کی تقریر وہ سنے جس کی شامت آئی ہو اور جس کو موت کے لئے کوئی بہانہ نہ ملتا ہو۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا "ارے یہ کیا انقلاب ہے کل تو آپ بے حد متاثر تھے۔" ہم نے کہا "جی ہاں، اسی کا اثر اب تک بھگت رہے ہیں۔ ایک مکھی سے پالا پڑا ہے اور اس نے جو گت بنا دی ہے، خدا کرے آپ کی اور آپ کی آئندہ نسلوں کی بھی گت بنے اور آپ کی زندگی بھی ایک مکھی کے ہاتھوں خدا کرے یوں ہی تلخ ہو۔" ڈاکٹر صاحب اصرار کرنا چاہتے تھے، مگر ہم غصہ میں گھر کے اندر چلے آئے اور وہ خدا جانے کتنی دیر تک آواز دیتے رہے ——

پروفیسر

جوہریوں کے لئے موتیوں کے اقسام، ڈاکٹروں کے لئے تپ دق کی قسمیں اور ماہرین اجرام فلکی کے لئے ستاروں کی مختلف نوعیتیں سمجھنا تو بہت آسان کام ہے لیکن موجودہ زمانہ کے پروفیسروں کی مختلف قسمیں کوئی شخص عبور کے ساتھ بتا دے تو ہم جانیں، اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں ہم نے جو تحقیقی قلم یا قدم اٹھایا ہے تو ہم خم ٹھونک کر یہ دعویٰ بھی کر رہے ہیں کہ ؎

جو کام کیا ہم نے وہ رستم سے نہ ہوگا

بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ جس مبحث پر ہم نے آج قلم اٹھایا ہے اس کو امتداد زمانہ نے اس قدر وسیع اور گنجان مبحث بنا دیا ہے کہ ؎

ذرے پڑے ہیں وسعت صحرا لئے ہوئے

یعنی اس سلسلہ میں ہماری عمر بھر کی تحقیق اور تفتیش کے بعد لکھا ہوا طویل طویل مقالہ بھی "مشتے نمونہ از خروارے" سے زیادہ کچھ اور ثابت ہو ہی نہیں سکتا، بات یہ ہے نا کہ اس لفظ "پروفیسر" نے ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایسی عالمگیر وسعت حاصل کی ہے کہ آج بغیر کسی جستجو کے دنیا کے ہر گوشے اور زندگی

کے ہر شعبہ میں آپ کو پروفیسر ہی پروفیسر نظر آئیں گے۔ اب سمجھنا آپ کا کام ہے کہ وہ کس قسم کے پروفیسر ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ پروفیسر علم اور تبحر کی اس مشین کو کہتے تھے جو تعلیمی کالجوں میں پائی جاتی تھی، اور جس سے یہ کام لیا جاتا تھا کہ جاہلوں کو عالم بنایا جائے۔ یا مختصر الفاظ میں بقول پنجابی احباب کے "لکچر پلانے" کی مشین کا نام پروفیسر ہوتا تھا۔ یہ انسانی شکل و صورت کی مشین جو کتابیں چاٹ چاٹ کر دیمک بھی نہیں بلکہ شاہ دیمک کہے جانے کی مستحق بن کر کالجوں میں پہلے رٹنے پھر رٹانے پہلے پڑھنے پھر پڑھانے اور پہلے خود سمجھنے اور پھر سمجھانے میں مصروف نظر آتی تھی آج بھی اپنی مقررہ تعداد سے آگے نہیں بڑھی ہے لیکن خدا جانے اس لفظ پروفیسر میں کہاں کی برکت آگئی ہے کہ جس کو دیکھئے بلا قید علم و جہل پروفیسر بنتا چلا جاتا ہے اور حشرات الارض کی طرح پروفیسر پر پروفیسر ابلتے چلے جاتے ہیں۔ پہلے تو صرف کسی کسی مکان پر اس قسم کا سائن بورڈ نظر آجاتا تھا کہ پروفیسر فلاں پی۔ ایچ۔ ڈی الہ آباد یونیورسٹی۔ مگر اب حال یہ ہے کہ سائن بورڈوں پر سے تو پروفیسر اڑ گیا ہے البتہ دیواروں پر چسپاں پوسٹروں میں یہ نظر آنے لگا ہے کہ "پروفیسر بلاقی اپنے حیرت انگیز کام سے ناظرین کو محو حیرت بنائیں گے۔" ان پروفیسر بلاقی کو علم سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی خاندانی روایات یہ ہیں کہ ان کے آدم سے اب دم تک کسی نے بھی پڑھنے لکھنے کی طرف توجہ نہیں کی، رہ گئی ان کی پروفیسری، اس کو منجانب اللہ سمجھئے یا سمجھ لیجئے کہ مادر زاد قسم کے پروفیسر ہیں۔ آپ ان کو دیکھئے تو بڑے بڑے چھلے دار بال اور تاؤ دی

مائل بہ پرواز مونچھوں کے ساتھ ایک ڈیڑھ فٹ کا رول لئے ہوئے پردہ اٹھتے ہی نظر آئیں گے، اور آپ کے سامنے تعظیماً تھوڑا سا جھک کر اسی ڈیڑھ فٹ کی لکڑی کو اٹھا کر ہوا میں ادھر ادھر بے معنی جنبش دے کر فرمائیں گے

"یہ میجک وان ہے جس کو جادو کی لکڑی کہتے ہیں۔ اس میں کہیں پر کوئی خول نہیں ہے۔ میں اس کو آپ کے سامنے میز سے بجاتا ہوں، دیکھئے یہ بالکل ٹھوس ہے، آپ میں سے کوئی صاحب اس کو لے کر دیکھ سکتے ہیں، اور یہ لکڑی کے تین بال یعنی گیند ہیں۔ ایک۔ دو۔ تین۔ بس تین ہی ہیں۔ نہ ایک زیادہ، نہ ایک کم، میں اس جادو کی لکڑی سے ان تینوں گیندوں کو چھو کر اس خالی ڈبہ میں ڈالتا ہوں۔ دیکھئے یہ ڈبہ خالی ہے، اس میں کوئی پردہ نہیں۔ ایک دو تین۔ یہ تینوں گیند اس ڈبہ میں پہنچ گئے۔ اب میں اس جادو کی لکڑی کو اس ڈبہ پر پھیرتا ہوں۔ ایک دو تین۔ ہاتھ کی صفائی ہے، نہ جادو ہے، نہ نظر کا پھیر، آپ کو معلوم ہے کہ میں نے تین گیند اس ڈبہ میں ڈالے تھے، دیکھئے میں نکالتا ہوں ـــــــ ارے یہ تو کبوتر نکل آئے ـــــــ"

پروفیسر بلاقی کا تبحر دیکھئے کہ خالی ڈبہ میں گیند ڈال کر ان کو کبوتر بنا دیا ایسا باکمال شخص اپنے کو پروفیسر نہ کہے تو کیا کہے۔

پروفیسر رام مورتی کے نام سے آپ واقف ہی ہوں گے، جو دو موٹروں کو کان پکڑ کے روک لیتا تھا اور ہاتھی کو اپنے سینہ پر اس طرح کھڑا کر لیتا تھا جس طرح ہم یا آپ بچوں کو کھلاتے ہیں۔ اب بتائیے اگر وہ پروفیسر کہلاتا تھا تو کون سی تعجب کی بات ہے۔ اسی طرح آج کل لنکا میں ایک پروفیسر کے۔ بی۔ ڈیو

پیدا ہوئے ہیں، جو بغیر آنکھ کی مدد کے دیکھنے کا طریقہ ایجاد کر چکے ہیں۔ اور اب اس فکر میں ہیں کہ اندھوں کو موٹر ڈرائیوری کی تعلیم دے کر کارآمد بنا دیں، ان کی یہ معجز نمائی کیا اس کی مستحق نہیں ہے کہ وہ اپنے کو پروفیسر کہیں۔ پروفیسر گھسیٹے کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ متعدد آہنی حلقے تماشہ گاہ کے پھاٹک پر لے کر کھڑے ہوتے ہیں اور ان حلقوں کو علیحدہ علیحدہ فضا میں اچھالتے ہیں، وہ سب حلقے تو ہوتے تو الگ الگ ہیں، مگر یہ پروفیسر قسم کا صاحب کمال ان کو کچھ اس طرح اچھالتا ہے کہ وہ ایک دوسرے میں پڑ کر زنجیر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کمال نے اور صرف اسی ایک کمال نے اس جاہل مطلق کندۂ ناتراش کو گھر بیٹھے پروفیسر بنا دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر طالب علموں کو انگریزی پڑھانے والوں سے لے کر تماشہ گروں تک کے لیے پروفیسری کا دروازہ کھلا ہوا ہے تو پھر آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ ایسے صاحبانِ کمال اپنے کو پروفیسر کیوں نہ کہیں، سرکسوں میں جانوروں کو سدھانے والے کالجوں میں پڑھانے والے پروفیسروں سے زیادہ پروفیسر کہلانے کے مستحق ہیں۔ کالجوں کے پروفیسر تو صرف لڑکوں کو یعنی انسانوں کے بچوں کو سدھاتے ہیں، مگر یہ سرکسی پروفیسر تو بندر کو سلام کرنا، بکرے کو کرسی پر بیٹھنا، کتے کو چشمہ لگانا، ہاتھی کو سونڈ سے سگریٹ پینا، حد تو یہ ہے کہ گدھے تک کو ناچنا سکھاتے ہیں، اب بتائیے یہ کیونکر پروفیسر کہلانے کے مستحق نہیں ہوتے، قصہ دراصل یہ ہے کہ ہر وہ شخص جس کو کسی مخصوص کام میں کوئی خصوصیت حاصل ہو وہی اپنے کو پروفیسر کہنے کا قانوناً نہ سہی مگر اصطلاحاً

حقدار ضرور بن جاتا ہے، ماہرینِ موسیقی، مشاق سازندے، باکمال نٹ۔ اپنے کام میں ہوشیار مداری، مختصر یہ عرض تو کیا کہ خدا جس کو توفیق دے وہی نہایت آسانی کے ساتھ پروفیسر بن کر مونچھوں پہ تاؤ دے سکتا ہے۔

بات یہ ہے کہ پہلے تو یہ کہا جاتا تھا کہ ع

کسبِ کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی

اور اب بجائے "عزیزِ جہاں شوی" کے کسبِ کمال کے بعد "پروفیسر شوی" کا درجہ ہے لہٰذا نہایت آسانی کے ساتھ لوگ کسی شغل میں کمال حاصل کر کے پروفیسری کا دُم چھلا اپنے اسم مبارک کے ساتھ لگا لیتے ہیں۔ البتہ اس عمومیت کا نتیجہ یہ ضرور ہوا ہے کہ کسی کے نام کے ساتھ لفظ پروفیسر لگا ہوا دیکھ کر یہ بات سمجھ میں ذرا مشکل سے آتی ہے کہ یہ حضرت سرکس میں تماشہ کرتے ہیں، یا ان کو کسی کالج میں طالبعلموں سے سر کھپانا پڑتا ہے، یا جنگلی جانوروں کو سدھاتے ہیں یہ پروفیسر صاحب تاریخ یا جغرافیہ کے متبحر عالم ہیں یا تان سین کے ارشد تلامذہ میں سے، بہرحال اب اس عمومیت کے ماتحت اب یہ بات تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں کہ جو سچ مچ کے پروفیسر ہیں وہ اپنی پروفیسری کو اچھالنے سے ذرا پرہیز کرتے ہیں کہ مبادا ان کو دنیا مداری سمجھ لے، یا گویا لیکن جو پروفیسر نہیں ہیں لیکن زبردستی بنے ہوئے ہیں انھوں نے تو شاید لفظ پروفیسر کو اپنے نام ہی کا نہیں بلکہ اپنے دستخط کا بھی جزو بنا لیا ہے۔ اور بغیر پروفیسر لکھے ہوئے وہ اپنا نام کسی صورت سے لکھ ہی نہیں سکتے، اس صورت میں ہم اپنے نزدیک یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جو اصل پروفیسر ہیں ان کی پروفیسری ان کے نام کا دُم چھلا

بنے بغیر بھی قائم رہتی ہے اور جو پروفیسر نہیں وہ بچارے اس کے لیے مجبور ہیں کہ اپنی پروفیسری کو جان کے ساتھ رکھیں۔ تاکہ کہیں چھوٹنے نہ پائے، بہرحال اب ہم کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا گیا ہے کہ جس کے نام کے ساتھ پروفیسر لگا ہوا دیکھیں اس کے متعلق نہایت شوق سے ہم مشکوک ہو سکتے ہیں کہ یہ علمی پروفیسر کے علاوہ خدا جانے کس قسم کا پروفیسر ہے۔ رہ گئی اس لفظ کی وسعت اس کو تو اب دنیا کی کوئی طاقت روک ہی نہیں سکتی، دیکھ لیجیے کہ اس لفظ سے پہلے لفظ "ماسٹر" کی کیسی گت بن چکی ہے۔ کہ اسکولی ماسٹروں کے دیکھا دیکھی، ٹیلر ماسٹر، بینڈ ماسٹر، سرکس ماسٹر ماسٹر راحت، ماسٹر بھگوان داس، ماسٹر منے، ماسٹر چھنے، طبلہ ماسٹر، ہارمونیم ماسٹر ڈفلی ماسٹر۔ اور خدا جانے کون کون ماسٹر پیدا ہو چکے ہیں، یہاں تک کہ "ہز ماسٹرس وائس کا کتا" تک یاروں نے پیدا کر کے چھوڑا۔ اب ماسٹر کے بعد پروفیسر کی باری ہے، بہرحال یہ ترقی کا ایک زینہ ہے، اس پر خوش ہونا چاہیے، چنانچہ اب پروفیسر شہباز جادوگر، پروفیسر سانیال پیانو نواز، پروفیسر خاک اور پروفیسر ڈھول پیدا ہو رہے ہیں، اور وہ دن دور نہیں ہے کہ ہمارے باورچی میاں جمن خاں بھی پروفیسر جمن خاں کہلائیں گے، پروفیسر درزی خانہ یعنی درزی صاحب بھی کیوں نہ پروفیسر بنیں۔ پروفیسر غسل خانہ بھی ہوں گے جن کے چارج میں کموڈ وغیرہ ہوگا، پھر پروفیسر نباتات ہوں گے، جن کی پوری یونیورسٹی سبزی منڈی کے نام سے گویا قائم ہی ہے، بندر نچانے والے تو مداری ہیں ہی وہ کیوں نہ پروفیسر بنیں، مختصر یہ کہ اب عنقریب وہ طوفان آنے والا ہے کہ ہم اپنے گرد و پیش پروفیسر ہی پروفیسر دیکھیں گے، اور اس وقت

کالجوں کے پروفیسر ذرا گھبرائیں گے کہ اب اپنے کو کیا سمجھیں اور دنیا سے کیا کہلوائیں، حالانکہ یہ سوال ابھی سے حل کرنے کے قابل بنا ہوا ہے مدارس کی اصلاح کی ضرورت کل کی طرح آج بھی ہے۔

ڈاکٹر

ہندوستان میں تعلیم اور تپ دق دونوں کی ترقیاں کچھ اس طرح ساتھ ساتھ جاری ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ میڈیکل کالجوں سے ہر سال ڈاکٹر زیادہ برآمد ہوتے ہیں یا ہر سال دق کے مریض قبرستانوں میں زیادہ داخل ہوتے ہیں بہرحال بظاہر تو ڈاکٹروں ہی کی تعداد زیادہ معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ دق کے مریض شہرت پسند نہیں ہوتے۔ اور نہ اپنے سائن بورڈ پر اپنا مرض لکھتے ہیں لیکن ڈاکٹروں کے سائن بورڈ تو اس کثرت سے نظر آتے ہیں کہ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ آخر اتنے ڈاکٹروں کو مریض کہاں سے ملتے ہوں گے۔ اور اتنے ڈاکٹروں کے تناسب سے اس ملک کے لوگ بیمار رہتے ہیں تو آخر یہ محکمہ حفظان صحت کس مرض کی دوا ہے۔ دراصل ڈاکٹروں کی کثرت سے صرف دو ہی نتیجے نکلتے ہیں اول یہ کہ اس ملک کی سو فی صدی آبادی دائم المریض ہے۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد طبابت کے بجائے کوئی دستکاری سیکھنے پر مجبور ہوتے ہوں گے یا پولیس میں بھرتی ہوجاتے ہوں گے یا کسی فلم کمپنی میں نوکری کرلیتے ہوں گے اس لئے کہ ڈاکٹروں کا تو یہ حال ہے کہ پیسے کے دو کا کھلا ہوا نرخ ہے۔ کسی گلی کوچے میں چلے جائیے وہاں آپ کو ایک آدھ ڈاکٹر ضرور مل جائے گا۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس نہ سہی۔ ایل۔ ایم۔ پی ہی سہی۔ ورنہ ہومیوپیتھک والے ایچ۔ ایم۔ بی

تو ضرور ہی مل جائیں گے اور یہ سب گویا ان ڈاکٹروں کے علاوہ ہوں گے جو سرکاری اسپتالوں میں مفت علاج کرنے اور مفت علاج کے ساتھ ہی مفت دوا دینے کے لئے بھی مقرر ہوتے ہیں۔ بتائیے کہ آخر ان سب کو مریض کہاں سے ملتے ہوں گے، اور اُن کی ڈاکٹری کیونکر چلتی ہوگی۔ سرکاری ملازمت محدود ہے اور ڈاکٹروں کی تعداد لامحدود۔ نتیجہ یہ ہے کہ چند تو سرکاری ڈاکٹر ہو جاتے ہیں۔ باقی سب بیوپاری ڈاکٹر بن کر پرائیویٹ پریکٹس کرتے ہیں۔ اور بالکل تجارت کے اصول پر اپنی ڈاکٹری چلاتے ہیں۔ ان بیچاروں کی گھریلو زندگی کیا ہوتی ہے اس کو دراصل باہر والے سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اور خود ہم کو بھی وہ نجی حالات قیامت تک معلوم نہ ہوتے اگر اس قسم کے ایک پرائیویٹ ڈاکٹر ہمارے پڑوسی نہ ہوتے۔

ہمارے یہ پڑوسی ڈاکٹر صاحب اچھے خاصے مکان میں اچھی خاصی آن بان کے ساتھ رہتے تھے مطب میں فرنیچر بھی اچھا خاصا تھا۔ اور سوٹ بھی باقاعدہ پہنتے تھے۔ موٹر گو سیکنڈ ہینڈ کے درجے سے گذر کر تھرڈ ہینڈ ہو چکا تھا اور اس کو بیک دیکھ کر وثوق کے ساتھ موٹر کہنا دشوار تھا مگر ہم کو معلوم ہے کہ وہ موٹر تھا ضرور اور اگر اس میں پٹرول ڈال دیا جاتا تھا تو چلتا بھی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ آواز اور رفتار کے اعتبار سے وہ کسی لاری اور چھکڑے کی سول میرج کی زندہ یادگار نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے سائن بورڈ پر ڈاکٹری کی ڈگری کا حوالہ بھی تھا۔ اور خود ہم نے مزید تصدیق کرنے کے لئے وہ ڈگری بھی ان کے مطب میں آویزاں دیکھ لی تھی۔ جس کے بعد یہ تو گویا طے ہی ہو گیا تھا کہ وہ سند یافتہ ڈاکٹر ہیں اب رہ گیا اس ڈاکٹری کا چلنا اس کو ہم نے ہمیشہ ان کی موٹر کی طرح چلتے دیکھا

اول تو آپ کے مطب میں مریض ہی کم نظر آتے تھے۔ اور جو کوئی نامراد ایک مرتبہ نظر بھی آگیا تو دوسری مرتبہ اس کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس جاتی تھیں اس سلسلہ میں روایات ذرا مختلف ہیں۔ خود ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ ایک ہی نسخہ میں چونکہ مریض بالکل تندرست ہو جاتا ہے لہٰذا وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ اور ان کی بیوی جو اخراجات کے سلسلہ میں مشکلات کا شکار رہتی تھیں اس بیان کی تردید کرتی تھیں بلکہ ان کا خیال یہ تھا کہ چونکہ تمہارا علاج کرتے ہی مریض مر جاتا ہے لہٰذا اس کو دوسری مرتبہ مطب آنا نصیب نہیں ہوتا۔ ان دو بیانات میں ایسا زبردست تضاد ہے کہ ایک غیر متعلق آدمی نہ ڈاکٹر صاحب کی تائید کر سکتا ہے نہ ان کی بیوی کی رائے سے متفق ہو سکتا ہے، بہر حال ڈاکٹر صاحب کی ظاہری شان و شوکت دیکھنے والے خواہ ان کو کچھ ہی سمجھتے ہوں مگر ہم تو روزانہ ان کے گھر کے جھگڑے سنا کرتے تھے، لہٰذا ہم کو معلوم تھا کہ اس خوبصورت غلاف میں کس قدر بدصورت تصویر ہے۔ اور اس عظیم الشان ڈھول میں کیسا زبردست پول ہے۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ ذرا کھاتے پیتے گھرانے کی تھیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب اپنا سب کچھ اپنی تعلیم پر صرف کرنے کے بعد صرف ڈاکٹر بنے تھے۔ اور اب ڈاکٹری کی بجائے اپنی بیوی کے زیورات کے رہین منت تھے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ عورت زیور کو کیا سمجھتی ہے اور کن حالات کے ماتحت کس طرح زیور کو جدا کرتی ہے اور اس امتحان میں کس حد تک ثابت قدم رہ سکتی ہے۔ بہر حال واقعات کچھ ایسے تھے کہ بیوی اپنی جان سے بیزار تھیں اور ڈاکٹر صاحب مکان والے سے شرمندہ تھے جس کا کرایہ اس حد تک چڑھ چکا

تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے اس سے منہ چرانا شروع کر دیا تھا۔ گھر میں ہیں تو کہلوا دیا کہ مریض کو دیکھنے گئے ہیں، راستہ گلی میں ملاقات ہو گئی تو بس ایک گھنٹہ کا وعدہ کر کے ٹال دیا۔ اس کے ڈر کے مارے مطب میں بیٹھنا چھوڑ چکے تھے اور باہر نکلتے بھی تو ڈرا چوکنا اور مالک مکان سے نظر بچاتے ہوئے، آخر ایک روز جب مکان دار نے کچھ نامناسب طریقہ پر دروازہ پر کچھ غیر طبی کلمات کہے تو ڈاکٹر صاحب کی بیوی کا پیمانہ صبر بھی لبریز ہو گیا۔ اور اس دن ہم کو یہ معلوم ہوا کہ ایک ڈاکٹر کی گھریلو اور بیرونی زندگی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ مکان دار کو تو خیر کسی نہ کسی طرح ٹال دیا۔ مگر بیوی نے فیصلہ کن انداز سے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ "میں پوچھتی ہوں کہ آخر اس کو کب تک ٹالا جائے گا۔ اور کب تک یہ بہانہ بازیاں ہوں گی۔ ایک اسی پر کیا ہے ہر کام میں دقت ہو رہی ہے، بچوں کی اسکول کی فیس۔ بیمہ کمپنی کی قسط آپ کی کتابوں کی قیمت۔ بزاز کے دام۔ ایک بات ہو تو کہی جائے یہاں تو ہر طرف کے تقاضوں سے تنگ آ گئی ہوں۔ مگر روپیہ کی صورت کہیں نظر نہیں آتی۔"

ڈاکٹر صاحب سعادت مندی کے ساتھ سنتے رہے۔ اور اس کے بعد انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ کہا۔ آخر تمہیں بتاؤ میں کیا کروں۔ میں ڈاکٹر ہوں ڈاکٹری کی سند موجود ہے مطب کرتا ہوں۔ نسخہ لکھنا جانتا ہوں نبض دیکھ لیتا ہوں اپریشن کر سکتا ہوں۔ مگر حال یہ ہے کہ مہینوں کوئی مریض ہی نہیں ملتا۔ آخر میں مریضوں کو کہاں سے لاؤں۔ اور تندرستوں کو پکڑ پکڑ کر کیونکر بیمار ڈالوں"

بیوی نے جل کر کہا: "تو پھر اس ڈاکٹری کم بخت کو چھوڑنا آخر کب تک یوں ہی

ایڑیاں رگڑی جائیں گی۔ اُس سے تو بھائی جان ہی اچھے۔ بساطی کی دوکان ہے مگر کسی کے قرضدار تو نہیں ہیں؟

ڈاکٹر صاحب نے معصومیت کے ساتھ کہا۔ "ڈاکٹر ہو کر ڈاکٹری کو کیسے چھوڑ دوں۔ آج تک کسی ڈاکٹر نے بھی یہ نہ کیا ہوگا کہ پاس تو کرے ڈاکٹری اور شروع کر دے ٹکٹ کلکٹری یا سب رجسٹراری۔"

بیوی نے کہا۔ "پھر آخر بات کیا ہے کہ تم کو ڈاکٹری سے کوئی آمدنی نہیں ہوتی ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "ایک مجھ ہی پر کیا منحصر ہے اس سڑک پر چار ڈاکٹر اور تین ہومیو پیتھک کے ڈاکٹر رہتے ہیں اور میں تو ان میں سے ہر ایک کے مطب میں سناٹا ہی دیکھتا ہوں۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ بدقسمتی سے اس شہر کی آب ہوا نہایت اچھی ہے اور یہ بھی ہمارا مقدر کہ کوئی وبائی مرض بھی شروع نہیں ہوتا۔ ادھر کچھ دنوں کے لئے ذرا ہیضہ شروع ہو گیا تھا تو تم نے دیکھا ہوگا کہ مکان دار کا کرایہ بالکل ٹھیک وقت پر دیا گیا۔ اور خود تم اس زمانے میں بے حد خوش نظر آتی تھیں مگر یہ قسمت کی گردش ہے کہ جب سے وہ ہیضہ گیا ہے آج تک اس شہر میں کسی کو چھینک تک نہیں آئی ورنہ میرے پاس کوئی تو مرا کھپا آتا۔"

بیوی نے کہا۔ "اور وہ جو تم سوداگر کے لڑکے کا علاج کر رہے تھے وہ آخر کیا ہوا۔ وہاں سے تو کبھی کبھی کچھ مل ہی جاتا تھا۔" ڈاکٹر صاحب نے گردن جھکا کر کہا۔ "وہ مریض تو مر گیا۔"

بیوی نے کہا ”اور وہ سیٹھ جی کی بہو بھی کیا تم نے مار ڈالی؟“

ڈاکٹر صاحب نے سر نیاز نیچا کر کے کہا ”نہیں صاحب وہ کم بخت تو حیرت انگیز طریقہ پر اچھی ہو گئی۔ میں نے لاکھ لاکھ اس کو جھلانا چاہا اور مرض کو ایک حالت پر قائم کر دینے کی ہر تدبیر کی مگر وہ ایسی بے حیا کہ اس کو ہر وہ دوا فائدہ کرنے لگی جس سے نقصان ہونا چاہیئے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بالکل اچھی ہو کر چلی گئی۔ دراصل یہ تمام باتیں مقدرات سے ہوتی ہیں۔

بیوی نے کہا ”تو کیا آج کل کوئی مریض تمھارے پاس نہیں ہے؟“

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ”ہیں کیوں نہیں دو مریض ہیں مگر ایک بیچارہ تو اس قدر غریب ہے کہ علاج کے علاوہ اس کی کچھ مالی مدد بھی کرنی چاہیئے، اور دوسرے صاحب کل ملے ان سے ذرا امید ہے، سنا ہے کہ ان کی مالی حالت اچھی ہے، وہ آنتوں کی دق میں مبتلا ہیں۔ تمام ڈاکٹروں نے آنتوں کی دق تجویز کر کے ان کو مایوس کر دیا ہے۔ مگر میں نے محض ضعف معدہ تجویز کر کے ان کو ذرا اٹکا لیا ہے۔ کل تو وہ خود مطب میں آئے تھے مگر میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آپ کے لئے نقل و حرکت مضر ہے، لہٰذا امید ہے کہ اب وہ مجھی کو بلائیں گے اور میں ان کا اس قابلیت سے انشاء اللہ علاج کروں گا کہ ——“

بیوی نے بات کاٹ کر کہا ”کہ وہ جلدی سے اچھے ہو کر چلے جائیں تاکہ یہ سلسلہ بھی جائے؟“

ڈاکٹر صاحب نے جھلا کر کہا ”اجی لاحول ولا قوۃ پہلے پوری بات تو سن لیا کرو۔ قابلیت سے علاج کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اپنا معتقد

بنالوں گا دونسخوں سے فائدہ ہوا تو پھر اس کو اس قابل بنا دیا کہ فوراً مجھ کو بلائیں پھر ذرا ان کی حالت میں سکون پیدا کر دیا اور پھر فیس وصول کرنے کے معاملات پیدا کر دیئے، اگر یہ سلسلہ کچھ روز چل گیا تو مکان کا پورا کرایہ انشاء اللہ ادا ہو جائے گا۔ اس لئے کہ مریض کی حالت ابھی ایسی ہے کہ اس کو کچھ دنوں اس مد و جزر میں رکھا جا سکتا ہے۔“

بیوی نے کہا۔ میں تو اس کم بخت ڈاکٹری کو خدا جانے کیا سمجھا کرتی تھی اور ڈاکٹروں کی آمدنی کے متعلق میرا خیال تھا کہ بہت ہوتی ہوگی۔ مگر میں پوچھتی ہوں کہ یہ جو بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں ان کو آخر مریض کہاں سے مل جاتے ہیں۔“

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ”اوہو یہ تمھارے سمجھنے کی چیز نہیں ہے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ روپیہ روپیہ کو کھینچتا ہے، وہ اعلیٰ درجہ کی کوٹھی میں رہتے ہیں اور فضول بھی اپنے موٹر کو ادھر ادھر دوڑاتے رہتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ ڈاکٹری چل رہی ہے۔ حالانکہ محض موٹر چلتا ہے۔ ڈاکٹری اتنی نہیں چلتی مگر رفتہ رفتہ موٹر کی طرح ڈاکٹری بھی چلنے لگتی ہے۔ اب اگر اس طرح میں موٹر دوڑاؤں تو جس طرح مکان دار نے جینا دوبھر کر دیا ہے اسی طرح پٹرول والے ناطقہ بند کر دیں اور موٹر روزانہ کارخانہ میں مرمت کے لئے کھڑا ہوا نظر آئے یوں ہی جب میں اس پر نکلتا ہوں تو لوگ دو رویہ کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے۔“

بیوی کچھ کہنا ہی چاہتی ہیں کہ باہر سے ڈاکٹر صاحب کو کسی نے آواز دی اور ڈاکٹر صاحب نے گڑبڑا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہ وہی مریض ہے جس

کا میں ابھی ذکر کر رہا تھا۔ اس سے کہلوا دیجیے کہ ڈاکٹر صاحب مریضوں کو دیکھنے گئے ہوئے ہیں آتے ہی ہوں گے۔ آپ مطب میں بیٹھیے۔ اتنی دیر میں کپڑے پہن کر پشت کے دروازہ سے میں بھی نکل جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر ادھر ڈاکٹر صاحب کپڑے پہننے لگے اور ادھر ہم نے کپڑے پہننا شروع کیے کہ آج ڈاکٹر صاحب کے مطب کی سیر کریں گے۔ اور ان کی یہ گھریلو حالت دیکھنے کے بعد ان کے مطب کی شان دیکھیں گے۔ چنانچہ جس وقت ہم پہنچے ہیں اس وقت تک ڈاکٹر صاحب مطب میں تشریف نہیں لائے تھے۔ اور ہم کو اس مریض سے ڈاکٹر صاحب کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ وہ مریضوں کو دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے ہیں۔ مگر ہمارے پہنچنے کے بعد ہی ڈاکٹر صاحب اپنا ہینڈ بیگ لئے ہوئے اس طرح تشریف لے آئے کہ گویا واقعی سینکڑوں مریضوں کو دیکھ کر آئے ہیں۔ مطب میں آتے ہی آپ نے حیرت سے اس مریض کو دیکھ کر کہا کہ "آپ غالباً وہ مریض ہیں جن کے متعلق میں نے مشورہ دیا تھا کہ آپ نقل و حرکت نہ کریں۔"

مریض نے کہا "جی ہاں میں وہی ہوں۔ مگر میں نے آپ کے حکم کی خلاف ورزی اس لئے کی کہ آج مجھ کو یوں ہی اٹھنا بھی تھا اس لئے کہ ایک مقدمہ کی آج پیشی ہے۔ لہذا میں نے کہا کہ آپ کو بھی دکھا دوں۔"

ڈاکٹر صاحب نے اپنے چہرہ پر خطرہ کی زنجیر لٹکاتے ہوئے کہا "مگر جناب زندگی اور تندرستی سب سے مقدم ہے۔ بہر حال میرا مشورہ ہے کہ آپ نقل و حرکت نہ کریں، ورنہ وہی چیز جو محض ضعف معدہ ہے ترقی کرکے آنتوں کو

زخمی کر سکتی ہے۔ اور دوسرے ڈاکٹروں نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہو سکتا ہے؟

مریض نے کہا "میں آئندہ احتیاط رکھوں گا۔ مگر آج تو دیکھ ہی لیجئے۔"

ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ "مجھے دیکھنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ مگر دیکھنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس لئے کہ نقل و حرکت کے بعد آپ کے تمام نظام میں ایک ہیجانی کیفیت ہوگی اور اس ہیجانی کیفیت میں میں کچھ نہ سمجھ سکوں گا۔"

ہم نے ڈاکٹر صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا کہ "چلنے پھرنے سے تو واقعی ضعف معدہ نہایت خطرناک ہو جاتا ہے۔ اکثر آنتیں الٹ جاتی ہیں اور بعض اوقات تو معدہ کا منہ پھر جاتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر کہا "جی ہاں میرے پاس ابھی چار روز قبل ایک مریض تھا اس نے چلنا پھرنا نہیں چھوڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضعف معدہ نے دق کی شکل اختیار کر لی۔ میں ان کے سلسلہ میں اسی لئے ڈرتا ہوں حالانکہ مریضوں کی کثرت کی وجہ سے خود میرے لئے یہ دقت ہے کہ میں کہاں سے وقت نکال کر ان کو دیکھنے گھر پر جاؤں گا۔ صبح ۷ بجے کا نکلا ہوا اب آیا ہوں اور اب پھر جا کر رات گئے واپس آؤں گا۔ مگر جس طرح بھی ہوگا ان کو دیکھوں گا مجھ کو تو ان کا علاج کر کے یہ دکھانا ہے کہ ذرا سی بات کو یہ ڈاکٹر فیس وصول کرنے کے لئے کس قدر خوفناک ثابت کر دیتے ہیں۔ آپ کو ذرا سخت قسم کا ضعف معدہ ہے اس کو آنتوں کی دق تجویز کر دیا۔"

مختصر یہ کہ اس مریض کو ڈاکٹر صاحب نے اس وقت یوں ہی ٹال

دیا۔ معلوم نہیں پھر اس نے ڈاکٹر صاحب کو گھر پر بلایا یا نہیں۔ بہر حال اب ڈاکٹر صاحب ہمارے پڑوسی نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب سے مکان دار کی آخر نبھ نہ سکی اور ڈاکٹر صاحب ایک کم کرایہ کے مکان میں رہنے پر مجبور ہوئے جس کے دروازہ پر سائن بورڈ مع ڈگری کے اب بھی لٹک رہا ہے۔ مگر موٹر کثرت استعمال سے اب صرف اس قابل رہ گیا ہے کہ دروازہ پر کھڑا رہے اور محلے کے بچے اس سے کھیلیں۔

بَرَدِکھوّا

ایک مرتبہ تو حجام نے بال کاٹنے کے ساتھ ڈاڑھی بنائی تھی، دوسری مرتبہ کوئی دو گھنٹے کے بعد خود ہم نے "دست خود دہان خود" کے اصول پر چلتے ہوئے احتیاطاً اس لئے نظر ثانی کر لی کہ مبادا کوئی کھونٹی رہ گئی ہو، اس کے بعد غسل خانہ میں پیرسوپ کی ایک بٹی مسلم اور دوسری نصف کے قریب اس کوشش میں صرف ہوئی کہ کسی طرح سنگ موسیٰ کو سنگ مرمر بنا دیں۔ غسل خانہ میں دو گھنٹہ تک سخت محنت کرنے کے بعد لباس بھی اسی اہتمام سے تبدیل کیا اور آئینہ کے سامنے نوک پلک کی احتیاط کے ساتھ سولہ سنگھار کئے، اور جب اپنے متعلق ہر حیثیت سے اطمینان کر لیا۔ تو ایک منصف مزاج غیر جانب دار نقاد کی حیثیت سے خود اپنے اوپر نظر ڈالی کہ آیا ہم کسی معزز گھرانے کے داماد اور خوش مذاق تعلیم یافتہ اور مہذب لڑکی کے شوہر بننے کے قابل ہیں یا نہیں؟ اور جب اس اعتبار سے بھی اپنے آپ کو خوب اچھی طرح پرکھ لیا تو اپنی ہونے والی سسرال کی طرف ایک مانگے کے موٹر پر روانہ ہو گئے۔

جن وکیل صاحب کے ہاتھ میں اس وقت ہماری قسمت کھلونا بنی ہوئی تھی یعنی جو ہمارے ہونے والے خسر تھے وہ خود اپنی کوٹھی کے برآمدے میں ٹہل رہے تھے، خدا جانے ہمارے انتظار میں یا اپنا ہاضمہ درست کرنے کے لئے۔ بہرحال ہم کو

دیکھتے ہی ایک زبردست "اخاہ" کے بعد انھوں نے ہاتھ بڑھایا اور ہم کو لئے ہوئے اپنے ڈرائنگ روم میں تشریف لائے۔ اس ڈرائنگ روم میں ہم کو جس صوفہ پر بٹھایا گیا۔ اس کے بالکل ہی قریب چلمن پڑے ہوئے دروازے بھی تھے۔ جن سے کچھ کھچڑی پکنے کی سی آوازیں آرہی تھیں۔ وکیل صاحب نے ایک موٹا سا سگار اپنے منہ میں دبا کر کہا۔

"تو آپ کے والد کا انتقال ہوگیا؟"

ہم نے ایک منٹ کے لئے سوچا کہ خدا جانے اس موقع پر والد کا بقید حیات ہونا مفید ہے یا مرحوم ہونا۔ مگر مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ سچ بولیں۔ لہذا ناپ تول کر اپنے الفاظ کو پہلے خود جانچا۔ اس کے بعد عرض کیا کہ جی ہاں ــــ والد مرحوم یعنی میرے والد صاحب قبلہ بہت عرصہ تک بقید حیات رہے مگر افسوس ہے کہ اب ان کا انتقال ہوگیا۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون"

وکیل صاحب نے جواب میں تین چار مرتبہ سگار کا دھواں اپنے دہان مبارک سے منتشر کرنے کے بعد کہا "ہوں" اور چلمن کے پیچھے سے ایک نہایت باریک آواز آئی "بے چارہ صورت سے بھی یتیم معلوم ہوتا ہے!"

ہمارے واسطے یہ ریمارک ذرا تشویش انگیز تھا کہ چہرے کے اوپر یتیمی برس رہی ہے۔ لہذا ہم نے فوراً رومال نکال کر اپنے چہرہ کا پسینہ پونچھا اور ذرا شادابی پیدا کرنے کی کوشش کی مگر ہم اسی کوشش میں مصروف تھے کہ چلمن کے پیچھے سے کسی نے کہا "کہ آپ کو اس سردی کے موسم میں پسینہ بھی

نکلتا ہے۔ غالباً شرما رہے ہیں۔ یا پھر یہ کوئی مرض ہے" اب ہم نے پسینہ بھی روکنے کی کوشش کی اس لئے کہ واقعی دسمبر کے مہینے میں پسینہ کیا معنی۔ وکیل صاحب نے فرمایا "تو آپ کے بزرگوں میں کوئی بڑا بوڑھا بھی ہے یا نہیں؟"

ہم نے کہا۔ جی ہاں ماشاء اللہ بہت سے بزرگ ہیں۔ خالو صاحب ہیں۔ ماموں صاحب ہیں۔ چچا صاحب ہیں۔ سب ہی ہیں۔"

وکیل صاحب نے کہا "تو پھر اس نسبت کی تحریک خود آپ نے کیوں کی۔"

ہم نے کہا "بات یہ ہے ــــ میں چاہتا تھا یعنی میرا مقصد یہ تھا کہ ــــ یوں ہی میں نے سلسلہ جنبانی کر دی تھی۔"

وکیل صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر کہا "کیا کہا آپ نے میں سمجھا نہیں۔"

ہم نے وکیل صاحب کو سمجھانے کے لئے کہا "میں نے یہ عرض کیا کہ ــــ میں یہ کہہ رہا تھا مطلب یہ تھا۔ چلمن کے پیچھے سے آواز آئی "کھل کھل کھل" اور ادھر یہ حال کہ ہم خود بھول گئے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ مگر چپکے سے پسینہ پونچھنے کے بعد ہم نے کہا۔ بات یہ ہے کہ میں اس سلسلہ میں خود ہی معاملات طے کرنا چاہتا تھا۔"

وکیل صاحب نے تبسم زیر لب کے ساتھ فرمایا۔ "آپ کچھ آزاد خیال معلوم ہوتے ہیں۔"

یہ سوال یقیناً خطرناک تھا۔ اس لئے خدا معلوم وکیل صاحب آزاد خیال آدمی کو کیسا سمجھتے ہیں۔ بہرحال ہم کو تو جواب دینا ہی تھا۔ لہٰذا ہم نے کہا۔ "آزاد خیال تو خیر کیا ہوں۔ مگر ہاں ذرا آزاد خیال ہوں۔"

وکیل صاحب نے فرمایا۔ "یہ کیا بات ہوئی؟"

ہم نے کہا۔ "جی ہاں میں اس مسئلہ کو آزاد خیالی سے ذرا غیر متعلق سمجھتا ہوں۔"

وکیل صاحب نے فرمایا۔ "اور قطع نظر اس مسئلہ کے آپ آزاد خیال ہیں یا نہیں؟"

اب ہم نے ذرا قابلیت سے کام لے کر کہا۔ "آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے، اس اعتبار سے تو میں بھی آزاد خیال ہوں۔"

وکیل صاحب نے فرمایا۔ "آپ کی تعلیم کہاں تک ہے؟"

ہم نے اس سوال پر پہلے ہی غور کر لیا تھا۔ اور اس کا جواب تیار تھا لہذا کہا کہ "میں نے تعلیم تو بہت حاصل کر لی ہوتی مگر بیماری کی وجہ سے تعلیم چھوڑ دی۔ اب انڈر گریجویٹ ہوں۔"

وکیل صاحب نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "بیماری کی وجہ سے! کیا آپ کو کوئی بیماری ہے؟"

ہم نے کہا۔ "جی نہیں ہے نہیں۔ بلکہ یوں ہی سا بخار آنے لگتا تھا۔"

وکیل صاحب نے فرمایا۔ "میاں صاحبزادے کوئی شخص محض یوں ہی سے بخار کی وجہ سے اپنی تعلیم نہیں چھوڑتا۔ آپ کو عرصہ تک بخار آیا ہوگا۔ اور آپ سخت بیمار رہے ہوں گے۔"

ہم نے کہا۔ "جی میں بخار میں کوئی سال بھر مبتلا رہا۔ اس کے بعد کچھ صحت ٹھیک ہوئی۔

چلمن کے پیچھے سے آواز آئی۔ "ہڈی چمڑا تو اب بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے مہینوں کا بیمار۔"

کسی نے چلمن کے پیچھے سے کہا: "نہ کہیں بیمار ہے، اس کی کاٹھی ہی ایسی ہے۔ اچھا خاصا چھریرا بدن ہے۔ اب تمھارے لئے تو کوئی عرش سے آئے تو پسند ہو۔"

دوسری آواز۔ "تم تو بہن ہر ایک کو پسند کر لیتی ہو۔ ذرا دیکھو تو کیسا چمرخ سا ہے۔ جب یہ جوانی ہے تو بڑھاپا کیا ہوگا۔"

وکیل صاحب نے کہا۔ "اب آپ کی صحت کا کیا حال ہے؟"

ہم نے کہا۔ "چھ سال سے بفضلہ چھینک بھی نہیں آئی۔"

وکیل صاحب نے کہا۔ "یہ تو خود ایک مستقل مرض ہے۔"

ہم نے جلدی سے کہا: "میری مراد یہ ہے کہ پھر میں بیمار نہیں ہوا۔"

وکیل صاحب نے فرمایا۔ "تو اب آپ جمناسٹ ہیں؟"

ہم نے کہا۔ "جی ہاں۔"

وکیل صاحب کچھ اور کہنا ہی چاہتے تھے کہ ان کا ملازم چائے لے کر آگیا اور وکیل صاحب نے اپنی تمام تر توجہ اسی جانب مبذول کر دی اور ہم نے اپنی توجہ چلمن کی طرف مبذول کی۔ جہاں ہمارے متعلق مسلسل تبصرے ہو رہے تھے۔ اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو کوئی ایک درجن معزز خواتین کا تحقیقاتی کمیشن اس وقت ہمارے متعلق رائے زنی میں مصروف تھا۔ ایک آواز آئی۔ "کہ شرمیلا تو بہت ہے۔"

دوسری آواز آئی "مگر عمر جتنی بتائی جاتی ہے اس سے زیادہ ہے۔"
تیسری آواز آئی۔ "بن ٹھن کے تو بہت آئے ہیں۔"
چوتھی آواز آئی۔ "آخر یہ اس قدر گھبرا کیوں رہے ہیں؟"
پانچویں آواز آئی۔ "ذرا دیکھو تو منہ کچھ ٹیڑھا ہے۔"
چھٹی آواز آئی۔ "عینک تو شوقیہ لگائی ہوگی۔"

ان کا ہر تبصرہ ہمارے دل کو بٹھائے دیتا تھا۔ اور بجائے اس کے کہ ہماری موجودہ کیفیت میں کوئی اصلاح ہو یہ ریمارک ہم کو اور بھی بدحواس کئے دیتے تھے۔ ہم دراصل نہ اس قدر حماقت مآب تھے نہ اس قدر یتیم صورت نہ اس قدر جلد مرعوب ہونے کے عادی تھے۔ نہ چوروں کی طرح ہمارا دل کمزور تھا۔ مگر یہاں چونکہ امتحان درپیش تھا۔ اور ہم بغرض تبصرہ یہاں موجود تھے، لہٰذا قدرتی طور پر یہ تمام کیفیتیں ہم پر طاری تھیں۔ اور خود ہم کو اس بات کا احساس نہایت شدت سے ہو رہا تھا کہ ہمارے لئے نہایت بری رائے قائم ہونا چاہیئے۔ یعنی اگر خود ہمارے پاس کوئی شخص اس کیفیت کے ساتھ آئے تو ہم خود اس کے متعلق کوئی اچھی رائے ذرا مشکل سے قائم کریں گے بہرحال ہم طے کر چکے تھے کہ قسمت کی بات تو دوسری ہے۔ لیکن بظاہر وکیل صاحب ہرگز اپنی صاحبزادی کی قسمت اس خاکسار سے شادی کر کے نہ پھوڑیں گے۔ ہم کو ان تمام خیالات کے بعد بالکل مایوسی ہو جاتی تھی۔ لہٰذا ہم بدستور "قدوسی" بنے بیٹھے تھے۔ وکیل صاحب نے چائے کی کیتلی سنبھالتے ہوئے کہا۔ آپ شکر کتنی پیتے ہیں۔ غالباً آپ شکر کم ہی پیتے ہوں گے۔ جدید

فیشن کے مطابق اور خود میں بھی نہایت خفیف سی شکر پیتا ہوں، ہماری چائے کے متعلق رائے یہ ہے کہ چائے صرف شکر کے لئے پینی چاہیئے، لہذا جس قدر بھی شیریں ہو اتنی ہی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہاں چونکہ معاملہ ہی کچھ اور تھا لہذا ہم نے کہا: "میں صرف نصف چمچہ چائے کی ایک پیالی میں پیتا ہوں"

وکیل صاحب نے نصف چمچہ شکر ڈال کر ایک پیالی تیار کی اور ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "بسم اللہ" اب سوال یہ تھا کہ ہم کو اس وقت "شکریہ" کہنا چاہیئے یا "جزاک اللہ یا تھینک یو" ہم اس الجھن میں کچھ گڑبڑا گئے۔ اور ہاتھوں میں کچھ ایسی ارتعاشی کیفیت پیدا ہوئی کہ چائے کی پیالی ہمارے ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔ مگر شکر ہے کہ اس کی چائے بجائے وکیل صاحب کے اوپر گرنے کے خود ہمارے اوپر گری اور پیالی فرش پر گر کر چکنا چور ہو گئی۔

جب ہم نے جلدی سے گھبرا کر کہا۔ "ارے لا حول ولا قوۃ"۔

وکیل صاحب نے ہم کو نہایت بری نظروں سے گھور کر دیکھا۔ اور نہایت خشکی سے کہا۔ کوئی مضائقہ نہیں"۔ ان کا ملازم منہ پھیر کر ہنسنے لگا۔ اور چلمن کے پیچھے سے دیر تک ہنسی کی آوازیں آتی رہیں۔ اس حادثہ کے بعد وکیل صاحب نے دوسری چار کی پیالی بنا کر دی۔ اور خدا معلوم ہم نے کب پی اس لئے کہ اب بالکل اپنے کو کھو چکے تھے۔ اور ہمارے حواس اب قطعاً بجا نہ تھے۔ خدا خدا کرکے چار کا دور ختم ہوا، اور پان کھا کر وکیل صاحب نے پھر سگار پینا شروع کر دیا۔ ہم تھوڑی دیر بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد

ارادہ کیا کہ اب رخصت ہونا چاہیئے، لہٰذا وکیل صاحب سے اجازت چاہی تو انھوں نے فرمایا کہ ”مگر ابھی آپ سے کوئی گفتگو تو ہوئی نہیں۔“

ہم بجنسہ بیٹھ گئے تو وکیل صاحب نے فرمایا۔ ”آپ شادی کیوں کر رہے ہیں؟“

اس وقت تو خیر ہم بدحواس تھے۔ مگر اب تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سوال کا جواب کیا ہونا چاہیئے، چنانچہ جس وقت ہم سے یہ سوال ہوا۔ ہم منہ کھول کر رہ گئے، وکیل صاحب نے کہا۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ شادی کرنے سے آپ کی کیا غرض ہے؟“

ہم نے کہا۔ ”کچھ نہیں۔“

وکیل صاحب نے کہا۔ ”پھر بلاوجہ کیوں شادی کرتے ہیں آپ؟“

ہم نے کہا۔ ”شادی کبھی بلاوجہ نہیں ہوتی۔“

وکیل صاحب نے ہنس کر کہا۔ ”آپ غالباً شادی اس لئے کر رہے ہیں کہ آپ کو کوئی شریک زندگی مل جائے۔ تاکہ آپ زندگی کے باقی لمحات ایک رفیق تنہائی کے ساتھ بسر کریں۔ تنہا نہ رہیں۔“

ہم نے جلدی سے کہا۔ ”جی ہاں۔“

وکیل صاحب نے کہا۔ ”تو آپ کیسی رفیقۂ حیات چاہتے ہیں؟“

ہم نے کہا۔ ”عالی خاندان۔ شریف النفس۔ تعلیم یافتہ وغیرہ۔“

وکیل صاحب نے کہا۔ ”شکل و صورت وغیرہ کی کوئی قید نہیں؟“

ہم نے کہا۔ ”اگر حسن ہو تو کیا کہنا۔“

چلمن کے پیچھے سے پھر ہنسی کی آواز آئی۔ لہٰذا ہم سمجھ گئے، یہ جواب حماقت آمیز تھا۔ چنانچہ ہم نے فوراً کہا۔ "مگر شکل و صورت کی چنداں پرواہ نہیں کرتا۔"

وکیل صاحب: "آپ عورت کی آزادی کے کس حد تک قائل ہیں؟"

ہم نے کہا: "میری رائے یہ ہے کہ عورت کا نشو و نما جس ماحول میں ہوا ہو، شوہر کو چاہیئے کہ اس کے لئے وہی ماحول مہیا کرے۔"

وکیل صاحب نے کہا: "بالکل درست ہے، اچھا تو اب میں آپ کو مفصل اور قطعی جواب کل تک لکھ کر بھیج دوں گا۔"

ہم وکیل صاحب سے رخصت ہو کر اپنے گھر آ گئے۔ اور گفتگو کے آخری حصہ سے ہم کو اس بات کی امید پیدا ہو گئی تھی کہ وکیل صاحب ضرور اس خاکسار کو اپنی غلامی میں قبول کر لیں گے۔ چنانچہ دوسرے روز ان کا جواب والا نامہ موصول ہوا، اس کو ہم نے نہایت ذوق شوق سے کھولا جس میں لکھا تھا۔

مکرمی تسلیم!

مجھ کو افسوس ہے کہ میں آپ کے پیغام کو منظور نہیں کر سکتا۔ اول تو اس لئے کہ آپ کچھ بیمار معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ کے ہاتھوں میں رعشہ ہے۔ تیسرے یہ کہ آپ کے نزدیک شادی بلا وجہ ہوا کرتی ہے۔ چوتھے اس لئے کہ آپ مہذب سوسائٹی میں معلوم ہوتا ہے کہ کم بیٹھے ہیں۔ پانچویں یہ کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس موٹر نہیں ہے۔ مگر آپ موٹر پر تشریف لائے تھے۔ چھٹویں اور آخر وجہ یہ ہے کہ میری بیوی نے آپ کے متعلق یہ

رائے قائم کی ہے کہ آپ ان کی لڑکی کے مقابلے میں غبی اور کودن واقع ہوئے ہیں۔ ان حالات کے ماتحت شادی بے جوڑ رہے گی۔ امید ہے کہ آپ اس طعنے زنی پر معاف فرمائیں گے۔

نیاز مند وکیل

وکیل صاحب کا خط دیکھ کر ہم اب بالکل مطمئن ہو گئے، کہ اگر اس وقت جب کہ کوئی امتحانی صورت در پیش نہیں ہے وکیل صاحب ہم کو دیکھیں تو یقیناً ان کو افسوس ہوگا کہ ایسے لاجواب داماد کی دامادی سے اپنے آپ کو اور ایسے ہزار دو ہزار میں ایک شوہر کی زوجیت سے اپنی لڑکی کو محروم کیا ہے ہم کو تو آخر بیوی مل ہی گئی۔ مگر یقیناً ان کو ایسا داماد نہ ملے گا۔

میں ایک بے روزگار ہوں

ہم بیکار تو یقیناً نہیں ہیں اس لئے کہ اس مختصر سی زندگی میں جو کارنمایاں ہم نے انجام دیئے ہیں وہ بجائے خود اس کی تردید میں پیش کئے جا سکتے ہیں کہ ایک بیکار آدمی اس قدر کارآمد ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مثلاً یہ کہ ہم نے متعدد چھوٹے چھوٹے امتحانات پاس کئے۔ یا یہ کہ صرف ایک بی۔ اے کے امتحان میں مسلسل اور متواتر تین سال تک فیل ہوئے۔ اس کے بعد ہم نے ایک شادی کی پھر دو مستقل بچے پیدا کئے یہ تمام باتیں آپ کو اس بات کا یقین دلا دینے کے لئے کافی ہیں کہ ہم بیکار نہیں ہیں۔ البتہ اس بات کا نہایت صفائی کے ساتھ ہم کو اعتراف کر لینا چاہیئے کہ ہم بے روزگار ضرور ہیں۔ مگر اس میں در اصل ہماری کوئی خطا نہیں ہے۔ بلکہ اگر سچ پوچھئے تو غلطی ہے ہر اس روزگار کی جس کو حاصل کرنے کی ہم کوشش کرتے ہیں۔ مگر وہ خود ہم سے گریزاں نظر آتا ہے۔

ہم آپ کو باور کرانا چاہتے ہیں اور شرافت کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ آپ ان تمام واقعات کو صحیح سمجھئے گا کہ ہم چار سال سے مسلسل روزگار کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ سب سے پہلے تو ہم نے پولیس سب انسپکٹری کے لئے زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ اور ممبران کونسل سے لے کر وزراء تک کی

سفارشیں اپنی تائید میں لاکر کھڑی کردیں مگر یہ مقدر ہی تو ہے کہ جب یہ تمام کوششیں کامیاب ہوئیں اور پولیس ٹریننگ اسکول میں داخلہ کا امکان پیدا ہوا تو خدا جانے کیونکر سینہ پورے چار انچ چھوٹا نکل گیا۔ اس سلسلہ میں روایات ذرا مختلف ہیں۔ ہمارے بعض احباب کا خیال یہ ہے کہ دراصل ہمارا سینہ چھوٹا نہ تھا۔ بلکہ سینہ ناپنے کا فیتہ ہی چار انچ بڑا تھا۔ اور خود ہمارا خیال یہ ہے کہ فیتہ بھی ٹھیک تھا اور سینہ بھی کافی چوڑا مگر اس قسم کے امتحانی مواقع پر ہماری ہمیشہ کی عادت ہے کہ کچھ سکڑ جاتے ہیں۔ اور یقیناً یہی واقعہ اس پیمائش کے وقت بھی پیش آیا ہوگا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو تمام سفارشیں دھری رہ گئیں۔ اور تمام کوششوں پر پانی پھر کر رہ گیا۔ اب آپ ہی بتایئے کہ اس میں ہمارا کیا قصور تھا۔ یقین جانئے کہ اگر سینہ کی طرف سے یہ گمان بھی ہوتا کہ عین وقت پر یہ دھوکا دے گا تو ہم سب سے پہلے اس کی خبر لیتے۔ اور ورزش وغیرہ کرکے اس خامی کو ہرگز باقی نہ رہنے دیتے، بہرصورت اب تو پولیس کے خیال ہی کو دل سے نکال دینا پڑا۔ اور سب انسپکٹری کے بعد نظر انتخاب سب رجسٹراری پر پڑی۔

سب رجسٹراری ایک معمولی سی تنخواہ کی چھوٹی سی ملازمت ہے مگر ہم نے تو ہر سب رجسٹرار کو اس قدر مطمئن اور خوش پایا ہے کہ گویا سب رجسٹرار ہونے کے بعد یہ حضرات وزارت عظمیٰ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ لہٰذا ہم بری طرح سب رجسٹراری پر فریفتہ ہوگئے۔ اور اس کے لیے کوئی ایسی کوشش نہ تھی جو اٹھا رکھی ہو۔ پہلے سال تو درخواست ذرا دیر میں گذری تھی، لہذا

معاملہ دوسرے سال پر ٹل گیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ گویا ہم کو ایک سال کا اور موقع ملا کہ ہم اپنی امیدواری کے استحقاق کو مستحکم بنائیں، چنانچہ یقین جانئے کہ ہم نے اس جگہ کے لئے وہ کوششیں کی ہیں کہ ہماری درخواست آخر کار قابل غور درخواستوں میں شامل کرلی گئی۔ اور اب نہ صرف ہم کو بلکہ ہر ایک کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ ہمارا انتخاب ضرور عمل میں آئے گا اور وہی ہوا بھی کہ ہم کو آخر کار انٹرویو کے لئے طلب کیا گیا۔ اور ہم اپنے گھر سے سب رجسٹرار کی حیثیت سے روانہ ہو گئے۔ مگر اب ذرا نحوست آپ ہی ملاحظہ ہو کہ عین انٹرویو کے وقت معلوم ہوا کہ ہماری عمر زیادہ ہے۔ اور زیادہ بھی کتنی صرف ایک دن ہم نے لاکھ چاہا کہ اس ایک دن کو نظر انداز کر دیا جائے مگر معلوم ہوا کہ اس ایک دن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ ہم خود ہی نظر انداز کر دیئے جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ایک دن کی بزرگی نے ہم کو یہاں بھی مارا اور اپنا سا منہ لے کر واپس آگئے۔ ناامیدی اور دل شکستگی کا جو عالم ہم پر طاری تھا اس کی تفصیل کچھ نہ پوچھئے مگر اس کے باوجود آپ انصاف سے کام لے کر بتائیں کہ اس میں آخر ہماری کیا خطا تھی۔ اگر ہمارے امکان میں ہوتا تو ایک دن کیا ایک ہفتہ بعد میں پیدا ہوتے، مگر قسمت میں تو یہ گردش لکھی تھی۔ ایک ہفتہ بعد کیونکر پیدا ہو سکتے تھے۔ یا کچھ روز قبل یہ انتخاب کیونکر ہو سکتا تھا۔

سب انسپکٹری کے بعد سب رجسٹراری کی کوشش میں اس غیر متوقع ناکامی نے ہمارے تمام حوصلے پست کر دیئے، اس لئے کہ اول تو

کس قدر لغو اور مہمل طریقہ پر ناکام ہوئے تھے دوسرے عمر متجاوز ہو چکی تھی، جس کے معنی یہ ہوئے کہ اب سرکاری ملازمت کا دروازہ ہم پر بند ہو چکا تھا ادھر گھر میں یہ حال کہ اس خاکسار مربی کو مربہ سمجھ کر اہل و عیال کھائے جاتے تھے، ماشاءاللہ بھرا ہوا گھر اور کھانے والے صرف ہم اور وہ بھی بے روزگار اس میں شک نہیں کہ آخر ہم کیا کرتے۔ اور ہمارے بس میں کیا تھا۔ مگر بیگم بھی ٹھیک کہتی تھیں کہ آخر وہ کیا کریں۔ اور گھر کا خرچ کیونکر چلائیں۔ ہمارا یہ حال کہ صبح سے روزگار کی تلاش میں نکلتے ہیں تو شام کو واپس آتے ہیں مگر بجنسہ اس طرح جس طرح گئے تھے، ادھر گھر والوں کا یہ حال کہ ہر ایک کی ضروریات ہم سے وابستہ ہیں۔ اور ہر ایک کی دعائیں ہمارے ساتھ ہیں۔ مگر وقت تو ایسا پڑا ہے کہ ہر دعا بد دعا ہو کر لگتی ہے۔ اور ہر کوشش مایوسی اور ناکامی پر ختم ہوتی ہے۔

سرکاری ملازمت کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد پرائیویٹ ملازمت کی فکر پیدا ہوئی۔ اور اس سلسلہ میں خدا کا شکر ہے کہ ہم کو زیادہ دوڑ دھوپ کرنا نہ پڑی۔ بلکہ فوراً ہی ایک تعلقدار صاحب کی ریاست میں منیجری کے عہدہ پر فائز ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک چھوٹا سا تعلقہ تھا مگر نام تو تھا ریاست کی منیجری کا۔ لہٰذا ہم خوش تھے کہ اس ملازمت پر قدم جما کر ترقی کی منزلیں طے کریں گے۔ اور تعلقدار صاحب کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ قابل منیجر بھی کیا چیز ہوتا ہے۔ ان کی ریاست بہت زیادہ مقروض تھی۔ اس حد تک مقروض کہ ہم کو اندیشہ تھا کہ شاید تنخواہ ماری جائے۔

مگر اس ملازمت کو غنیمت اس لئے سمجھ رہے تھے کہ بے روزگاری کے طعنوں کر نجات مل جائے گی اور اگر تنخواہ نہ بھی ملی تو واجب الادا کہلائے گی اس کے علاوہ کچھ نہ کچھ تو ملتا ہی رہے گا۔ جو اس موجودہ کچھ بھی نہیں سے بہرحال بہتر ہوگا۔ یقین جانئے کہ جس وقت ہم نے اپنی ملازمت کا مژدہ گھر والوں کو سنایا ہے سب باچھیں کھل گئیں، کسی نے نماز شکرانہ ادا کی تو کسی نے ہماری بلائیں لینا اور ہم کو دعائیں دینا شروع کر دیں۔ گویا سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ اور واقعی خوشی کا مقام بھی تھا کہ تین سال کی امیدواری اور ہر امیدواری میں ناکامی کے بعد یہ صورت نظر آئی تھی۔ چنانچہ دوسرے دن جب ہم اپنے عہدہ کا چارج لینے کے لئے چلے تو پانوں کی ڈبیہ بھی تیار تھی اور نیا بٹوہ بھی بھر دیا گیا تھا اور بالکل ایسے انتظامات تھے کہ گویا ہم لام پر جا رہے ہیں۔ امام ضامن کی ضامنی مبارک سلامت کے نعروں اور دہی مچھلی کے شگون کے ساتھ ہم گھر سے روانہ ہوئے، راجہ صاحب کی کوٹھی کی طرف۔ اب ذرا ملاحظہ ہو ہماری سبز قدمی کہ راجہ صاحب کی کوٹھی میں جب پہنچے تو معلوم ہوا کہ کسی ماتم کدے میں داخل ہو گئے ہیں، ہر طرف غمناک سناٹا اور در و دیوار سے یاس برس رہی تھی، ہر ایک گردن لٹکائے ہوئے تصویر حسرت نظر آ رہا تھا۔ ہم نے اپنے دل میں کہا الٰہی خیر معلوم نہیں یہاں کیا سانحہ ہوا ہے۔ اب پوچھنے کی بھی کسی سے ہمت نہ ہوتی تھی۔ کہ خدا جانے کیا خبر وحشت اثر سننے میں آئے۔ آخر کار پھونک پھونک قدم رکھتے ہوئے راجہ صاحب کی بیٹھک میں جب پہنچے تو وہ بھی داغ فراق صحبت شب کی جلی

ہوئی شمع کی طرح بیٹھے تھے۔ خیر اس طرف سے تو اطمینان ہو گیا کہ خود راجہ صاحب بفضلہ اچھے ہیں مگر سانحہ یقیناً ایسا سخت تھا کہ خود راجہ صاحب پر بھی اس کا بے حد اثر معلوم ہوتا تھا۔ وہ شدت غم سے گم سم نظر آرہے تھے۔ آخر ہم نے خود ہی اپنے ایک ہم نشین سے چپکے سے پوچھا "آخر واقعہ کیا ہے؟"

ہم نشین نے چپکے سے جواب دیا۔ علاقہ کورٹ ہو گیا۔"

ہم نے بے ساختگی کے ساتھ کہا "کورٹ"!

ہم نشین نے کہا "ہاں ابھی تار آیا ہے"

یقین جانئے کہ دل کی حرکت نے بند ہونے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ فوراً یہ ضرب المثل ذہن میں آگئی کہ "جہاں جائے بھوکا وہاں پڑے سوکھا" راجہ صاحب کو یقیناً اپنے علاقہ کے کورٹ ہونے کا بس اسی قدر صدمہ ہوگا کہ جس قدر ہم کو اپنی ملی ملائی ملازمت کے اس طرح جانے کا صدمہ تھا۔ دل بیٹھا جاتا تھا اور آنکھیں رونے کے لئے بے قرار تھیں پھر بھی ایک آدھ سرد آہ اگر سرزد ہو گئی ہو تو کوئی تعجب نہیں اور اس کو بھی راجہ صاحب کی ہمدردی میں شامل کر لیا گیا ہوگا۔ ہم تھوڑی دیر راجہ صاحب کے پاس بیٹھے رہے۔ اس کے بعد جب راجہ صاحب تخلیہ میں تشریف لے گئے تو ہم نے سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا شروع کر دیا کہ آخر اب ہم کہاں جائیں، زمین سخت تھی اور آسمان دور۔ گھر میں منہ دکھانے کے قابل نہ تھے، اور باہر آوارہ گردی میں چالان کا اندیشہ تھا۔ راجہ صاحب کی میز پر رکھا ہوا اخبار یوں ہی اٹھا لیا۔ مگر یہ بھی عجیب اتفاق کہ اس میں سب سے پہلے "ضرورت ہے" کے

کے عنوان پر نظر پڑی۔ حالانکہ وہ اشتہار ہمارے متعلق نہ تھا۔ بلکہ مشتہر کو ضرورت تھی ایک ایسی لڑکی کی جو حسین و جمیل، سگھڑ اور شریف خاندان ہو، ظاہر ہے کہ یہ اشتہار ہمارے کام کا نہ تھا۔ مگر اس کے نیچے ہی دوسرا اشتہار تھا۔ جس میں ضرورت تھی ایک ایسے تجربہ کار اسسٹنٹ ایڈیٹر کی جو ترجمہ میں مہارت رکھتا ہو۔ اور جس کو قلم برداشتہ سیاسی مسائل پر شذرات لکھنے کی مشق ہو۔ یہ اشتہار ہمارے شہر ہی کے ایک روزنامہ کی طرف سے دیا گیا تھا۔ لہٰذا ہم اخبار لئے ہوئے راجہ صاحب کی کوٹھی سے سیدھے اس اخبار کے دفتر کی طرف روانہ ہو گئے، اس لئے کہ اس وقت گھر جانا ہمارے لئے دشوار بھی تھا اور گھر والوں کے لئے خطرناک بھی کہ جس وقت ہم اپنی ناکامی کا روح فرسا واقعہ سنائیں گے تو اس وقت خدا جانے کس کس کے قلب کی حرکت بند ہو جائے۔ اور شدت غم سے خدا جانے کس کا کیا حال ہو، یہ تو ہو سکتا تھا کہ ہم گھر پر جا کر یہ کہہ دیں کہ راجہ صاحب کی ریاست کے منیجر نہیں بلکہ ایک اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے ہیں۔ مگر ایک سرے سے کچھ بھی نہیں کی خبر سننے کا کوئی بھی متحمل نہیں ہو سکتا تھا، بہر صورت ہم جس وقت اخبار کے دفتر میں پہنچے ہیں وہاں نہایت انہماک کے ساتھ اخبار کی ترتیب کا کام جاری تھا۔ ہم نے چیف ایڈیٹر صاحب کو اطلاع کرائی اور فوراً ہم کو باریابی کی اجازت مل گئی۔ یہ حضرت عمر خیام کے قریبی بزرگوں میں سے معلوم ہوتے تھے۔ بالکل سفید ڈاڑھی، موٹے موٹے تالوں کی عینک لگائے اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ گویا آپ فادر کرسمس کے بڑے بھائی ہیں اور حضرت

نوح کی کشتی میں سوار ہونا بھول گئے تھے۔ لہٰذا اس کمرے میں بیٹھے رہ گئے ہیں ہم کو دیکھتے ہی آپ نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر فرمایا۔ "کیسے زحمت فرمائی۔"

ہم دراصل اس وقت بے حد مرعوب ہو رہے تھے۔ لہٰذا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں۔ البتہ اخبار اٹھا کر ان کو دکھایا اور صرف یہ کہہ سکے کہ "یہ آپ کا اخبار ہے آج ہی کی تاریخ کا۔"

ایڈیٹر صاحب نے کہا۔ "جی ہاں اس سے آپ کا مقصد؟"

اب ہم خود سمجھ گئے کہ ہم نے کس قدر نامعقول بات کہی تھی۔ لہٰذا ذرا معقولیت کے ساتھ کہا۔ "اس میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت کا ایک اشتہار چھپا ہے۔"

ایڈیٹر صاحب نے عینک سے اپنی نگاہیں پھسلا کر کہا۔ "آپ اس جگہ کے امیدوار ہیں؟"

ہم نے کہا کہ "جی ہاں۔"

ایڈیٹر صاحب نے ہم کو گھورتے ہوئے کہا۔ "آپ ترجمہ کر سکتے ہیں؟"

ہم نے کہا۔ "جی ہاں۔"

ایڈیٹر صاحب نے ایسوشی ایٹڈ پریس کا ایک تار دیتے ہوئے کہا، "اس کا ترجمہ فوراً کر دیجیے۔"

ہم نے اس تار کو لے کر دیکھا اور پھر غور سے دیکھا۔ مگر صرف اسی قدر سمجھ سکے کہ انگریزی رسم الخط میں خدا جانے کونسی زبان لکھی ہوئی ہے، تاہم

قلم لے کر ترجمہ کی کوشش شروع کر دی۔ اور عین اس وقت جب کہ ایڈیٹر صاحب نے اپنی گرج دار آواز میں کہا "کر چکے آپ ترجمہ؟" ہم نے نصف سے زیادہ ترجمہ ایڈیٹر صاحب کے حوالے کر دیا۔ ایڈیٹر صاحب نے ترجمہ کی شاید ایک ہی سطر پڑھی ہوگی کہ بڑی زور سے ڈونک کر پوچھا، "یہ آپ نے ٹھہرو ٹھہرو بار بار کیا لکھا ہے؟" ہم نے "تار" دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ میں خود نہیں سمجھا کہ اس میں جا بجا اسٹاپ اسٹاپ کیا لکھا ہے؟" ایڈیٹر صاحب نے مسکرا کر ترجمہ رکھتے ہوئے کہا "آپ نے کہیں کسی اخبار میں کام نہیں کیا ہے؟"

ہم نے کہا "جی نہیں۔"

ایڈیٹر صاحب نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔ "تو پھر آپ کے لئے صرف ایک صورت یہ ہے کہ آپ امیدوار کی حیثیت سے بلا تنخواہ کام سیکھیں اگر کارآمد ہو سکے اور جگہ خالی رہی تو آپ کو مل جائے گی۔"

ایڈیٹر صاحب کے اس جواب پر غور کرنے کی ضرورت تھی، بشرطیکہ غور کرنے کی مہلت بھی دی جاتی، بہرصورت ہم نے اس وقت یہی مناسب سمجھا کہ رضامند ہو جائیں۔ چنانچہ ہم کو امیدوار مترجم کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔ مگر اب سوال یہ تھا کہ آخر ہم گھر پر جا کر کیا کہیں۔ اخبار کے دفتر میں ملازمت تک تو خیر کوئی مضائقہ نہ تھا مگر یہ سمجھانا کوئی آسان بات نہ تھی کہ فی الحال تنخواہ کچھ نہ ملے گی۔ اس لئے کہ گھر والوں کو تو ضرورت تنخواہ کی تھی۔ ملازمت کی نہیں۔ وہ اس کو تو گوارا کر سکتے تھے کہ فی الحال تنخواہ ملے خواہ ملازمت بعد میں ملتی رہے۔ مگر یہ صورت ان کو منظور نہیں ہو سکتی تھی کہ ملازمت مل گئی ہے مگر

فی الحال تنخواہ نہ ملے گی، بہرصورت گھر جانے کا ایک بہانہ مل گیا۔ لہٰذا ہم گھر پہنچے۔ اور قبل اس کے کہ راجہ صاحب کے یہاں کی ناکامی کا افسانہ سنائیں اخبار کی ملازمت کا حال سب سے پہلے سنایا۔ اس کے بعد راجہ صاحب کے یہاں کی ناکامی کا قصہ گوش گذار کیا اور سب کے آخر میں یہ بھی دبی زبان سے کہہ دیا کہ ابھی تنخواہ طے نہیں ہوئی ہے کام دیکھنے کے بعد طے ہوگی۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ یہ سنتے ہی سب کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ اور سب کے چہروں پر مردنی چھا گئی۔ مگر مردنی چھائے یا کچھ ہو سوال تو یہ ہے کہ آخر ہم کیا کریں۔ زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ روزانہ اخبار کے دفتر میں ترجمہ کرنے جاتے ہیں اور وہاں وقت نکال کر تمام اخبارات میں "ضرورت ہے" کے اشتہارات بلاناغہ پڑھ جاتے ہیں اور ہر جگہ کے لئے ایک درخواست روانہ کر دیتے ہیں اس کے بعد بھی اگر نوکری نہ ملے تو یہ ہمارا مقدر۔

سرود خانۂ ہمسایہ

بیگم نے گھوڑے سے شہ دیتے ہوئے کہا۔ "اب بچائیے اپنے وزیر اعظم کو" پڑوس کے مکان سے ہارمونیم کے ہلکے سروں میں لپٹی ہوئی نہایت باریک آواز آئی۔ "جیارا ہائے ڈولے ہو۔" اور ہم بساط کی طرف سے خالی الذہن ہو کر لگے جھومنے۔ ایک تو موسیقی سے پیدائشی ذوق ہے، دوسرے اس وقت ماحول بھی کچھ ایسا تھا کہ شطرنج بالکل بے تکی ثابت ہو رہی تھی۔ اور ہماری بد مذاقی کا روشن ثبوت پیش کر رہی تھی۔ آسمان پر گھٹائیں میخانے کھول رہی تھیں ہوا کے سرد جھونکے بادہ طلب بنے ہوئے تھے۔ حد نظر تک سرو کے درخت جھوم جھوم کر رہے تھے، رہی سہی جو نغمہ کی کمی تھی وہ بھی اب پوری ہو گئی تھی اور ہم تھے کہ شطرنج سے شوق فرما رہے تھے، اس سے بڑھ کر بد مذاقی بلکہ بد تمیزی اور کیا ہو سکتی تھی۔ بیگم نے ہمارا منہ دیکھتے ہوئے پھر کہا۔ "ارے یعنی آپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب بچائیے اپنے وزیر اعظم دام اقبالہٗ کو۔"

ادھر پھر آواز آئی اور اسی طرح ہارمونیم کے دل میں پیوست ہو جانے والے سروں کے ساتھ۔ "جیارا کس کے ہمکے ہو۔" ہم اس وقت واقعی کھو گئے تھے اور یہ غور کر رہے تھے کہ گانے والی جس کی آواز میں یہ سحر ہے آخر خود کیا ہو گی اس کی اس تمیز داری اور خوش سلیقگی پر دل سے داد دینے کو دل چاہتا تھا کہ

اس نے ان رنگین فضاؤں کا نہایت مناسب طریقہ پر خیر مقدم کیا ہے اور اسی کے ساتھ اپنی اس شطرنج بازی پر غصہ آ رہا تھا، مختصر یہ کہ اس وقت ہم خدا جانے کہاں تھے کہ بیگم نے پھر ہم کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "آخر آپ ہیں کہاں چلیے نا اب کوئی چال۔"

ہم نے کہا "کیا پڑوس کے مکان میں کوئی کرایہ دار آگیا ہے؟"

اب تو بیگم نے بھی شطرنج کی طرف سے اپنی تمام توجہ ہٹا کر ہماری طرف مبذول کر دی۔ اور ایک زہریلے طنز کے ساتھ کہا "یہ کہیے کہ اس وقت آپ گانا سن رہے ہیں۔"

ہماری حماقت ملاحظہ ہو کہ سچ بولنے لگے "واقعی خوب گا رہی ہے آواز میں درد بھی ہے اور عجیب لچک ہے۔"

بیگم نے تیوریوں پر بل ڈالتے ہوئے کہا "تو پھر وہیں تشریف لے جائیے نا تاکہ ان کو بھی تو اپنی آواز کی داد مل جائے۔"

ہم نے واقعہ کی سنجیدگی کو سمجھے بغیر کہا "مگر یہ ہیں کون؟"

بیگم نے غصہ میں بساط کے مہرے منتشر کرتے ہوئے کہا "میں کیا جانوں کون ہیں، آپ ہی تحقیقات کیجیے۔"

اب ہم سمجھے کہ ہم نے اپنی سادگی میں بیگم کو کس حد تک برہم کر دیا ہے۔ اور اگر اب بھی ہم سیاسی نااہلی کا ثبوت دیتے رہے تو یہی معمولی سی بات انتہائی نزاکت اختیار کرے گی۔ لہذا ہم نے مسکراتے ہوئے کہا "نہیں میں یہ غور کر رہا تھا کہ اگر آپ گانے کی کوشش کریں تو آپ کی آواز نہایت

موزوں ثابت ہو۔ خصوصاً ہارمونیم سے آپ کی آواز کو بہت مناسبت ہے، یہ بیچاری تو معلوم نہیں کہ گا رہی ہے یا رو رہی ہے۔"

بیگم نے فخر آمیز کسرِ نفسی کے ساتھ کہا۔ "اب لگے مجھے بنانے، ابھی تو اس کے گانے کی تعریف ہو رہی تھی، ابھی وہ گانا رونا بھی ہو گیا۔"

ہم نے اپنی ترکیب کو کامیاب دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، واقعی آپ گانا سیکھئے آپ کی آواز صرف گانے کے لئے بنی ہے۔

بیگم بیچاری آخر تھیں نا عورت آ گئیں شوہرانہ چال میں اور اپنی آنکھوں میں اپنے اس مدبر ان شوہر کے لئے محبت کے خزانے بھر کر ذرا شرما کر بولیں "کیا آپ سے اچھی ہے میری آواز۔ آپ جس وقت شعر پڑھتے ہیں میں رشک کرتی ہوں۔"

ہم نے کہا۔ "اجی لاحول ولاقوۃ۔ اب تھوڑی دیر میں آپ ٹائیگر کے بھونکنے میں بھی زمزمے ثابت کریں گی، البتہ جب آپ شہادت نامہ پڑھتی ہیں تو مجھے بے ساختہ رونا آجاتا ہے۔ اور چیخ چیخ کر رونے کو دل چاہتا ہے۔"

بیگم نے کہا۔ "تو گانا میں آخر کس سے سیکھوں، ان پڑوسن کو گانا سکھانے کے لئے ایک بنگالی آتا ہے، یہ خود بھی بنگالی ہیں۔ ابھی شادی نہیں ہوئی ہے لڑکی ہی سی ہے بالکل اور گانا اس طرح سیکھتی ہے جس طرح ہمارے یہاں کے بچے لکھنا پڑھنا سیکھتے ہیں مگر میں تو اس بنگالی سے سیکھنے سے رہی۔"

ہم نے کہا۔ "نہیں نہیں۔ آپ بنگالی سے کیوں سیکھیں آپ تو ان ہی صاحبزادی سے رسم بڑھائیے اور اس کے بعد ان ہی سے مشق کیجئے۔ اگر آپ کچھ چل نکلیں تو پھر

کوئی انتظام کر دیا جائے گا۔"

بیگم اس صورت پر راضی ہوگئیں اور ادھر ہم کو بھی اطمینان ہوگیا کہ اول تو جو خطرہ پیدا ہوگیا تھا وہ اس وقت نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ دور ہوگیا۔ دوسرے اس سحر موسیقی سے مسحور ہونے کے لئے مستقلاً انتظام بھی ہوگیا۔ ورنہ آج ہی ہم کو یہ مکان چھوڑنا پڑتا اور پھر بیگم صاحبہ ہم کو کہیں ایسی جگہ رکھتیں جہاں دور دور تک موسیقی یا لطافت کا اندیشہ نہ ہوتا تاکہ ان کا یہ منچلا شوہر اس قسم کی آفات سے محفوظ رہتا۔ مگر اب ایک مصیبت یہ تھی کہ ہم کو گویا آج کے دن سے لے کر مرتے دم تک اس سلسلہ میں جھوٹ بولنا تھا۔ اور جھوٹ بھی اکہرا نہیں بلکہ دوہرا یعنی اول تو یہ کہنا کہ یہ بنگالی لڑکی اچھا نہیں گاتی ہے اور اس کی آواز نہایت خراب ہے، دوسرے یہ کہ بیگم کو اس بات کا یقین دلانا تھا کہ وہ واقعی بہت عمدہ گاتی ہیں۔ اور ان کی آواز صرف موسیقی کے لئے بنی ہے۔ حالانکہ ان بیچاری کی سرگم پاش آواز صرف بچوں کو ڈانٹنے کے لئے مناسب تھی اور اسی مناسبت سے شوہر کی ہر خلاف مرضی بات پر مسلسل اور دھواں دھار تقریر کے لئے نہایت موزوں تھی بلکہ ہم تو ان کی تقاریر سنتے سنتے اب اس کے قائل ہوگئے ہیں کہ اگر یہ عورت ہوکر ہماری بیوی نہ ہوجاتیں تو ہندوستان کی لیڈر ورنہ پولیس کی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ضرور ہوتیں۔ اور اب بھی ان میں اس کی صلاحیت تو بہرحال موجود ہے کہ وہ شوہروں کو ڈانٹ پھٹکار میں رکھنے کے لئے تمام ہندوستان کی بیویوں کی نمائندگی کرسکتی ہیں۔

بیگم کے تعلقات اپنی بہن ہمسائی سے ادھر بڑھ رہے تھے، ادھر ہم

نہایت خاموشی کے ساتھ ان آوازوں پر مٹنے میں مصروف تھے۔ جو فضا میں گونج کر واقعی زمزمے برسا دیا کرتی تھیں۔ غضب کی آواز تھی اور پھر موسیقی میں مہارت اور بھی قیامت تھی۔ ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ جس وقت وہ مست ہو کر کوئی تان لیتی تھی، معلوم یہ ہوتا تھا کہ اس وقت زمین اور آسمان کو ٹکرا دے گی ہم نے محض گانا سننے کے لئے یہ انتظام کیا تھا کہ مقررہ وقت پر اخبار یا کتاب لے کر بیٹھ جاتے تھے تاکہ ہم کو بیگم مطالعہ میں محو سمجھیں، مگر در اصل ہم اس وقت آنکھوں سے نہیں بلکہ کانوں سے کام لیتے تھے۔ البتہ ان اوقات میں ہمارا گھر پر رہنا ممکن نہ تھا جب بیگم اپنے نئے ہارمونیم پر تان سین کی روح کو خود کشی پر مجبور کرتی تھیں اس وقت ہم دانستہ کہیں ٹل جاتے تھے۔ ورنہ فن موسیقی کی یہ زبوں حالی اور نغمہ کی یہ درگت ہم سے نہ دیکھی جاتی۔ اس میں شک نہیں کہ اب ہم پھر سیاسی غلطی کر رہے تھے کہ بیگم کے مشاغل موسیقی سے اس قدر گریزاں تھے، ورنہ ہم کو چاہیے تھا کہ ان کی برابر حوصلہ افزائی کرتے، تاکہ وہ آسانی کے ساتھ ہماری ان کیفیات کا اندازہ نہ کر سکتیں جو ہم پر پڑوسن کا گانا سن کر طاری ہو جاتی تھیں۔

ایک دن ہم بدستور مطالعہ میں مصروف تھے یعنی سامنے کھلا ہوا اخبار رکھا تھا اور در اصل ہم گانا سن رہے تھے، اس قدر کافر انداز سے وہ گا رہی تھی "ناگن سی بل کھائے کمریا۔ ناگن سی بل کھائے" کہ ہم واقعی بل کھائے جاتے تھے آج اس کی آواز میں درد کے بجائے شرارت اور شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اور یقیناً وہ اپنے ہارمونیم کو آج شرمائے دیتی تھی ہم اس قدر محو تھے کہ بیگم

کے آنے اور آکر قریب بیٹھ جانے کی بھی خبر نہ ہوئی۔ بلکہ انھوں نے شاید کچھ کہا بھی مگر ہم نے ان کی آواز بالکل اس طرح سنی جس طرح کوئی سوتے میں کچھ سنتا ہے مگر سمجھ نہیں سکتا۔ اور نہ جواب دیتا ہے۔ آخر انھوں نے بآوازِ بلند کہا۔ "میں پوچھ رہی ہوں کہ آج دفتر جائیے گا یا نہیں؟"

ہم نے چونک کر کہا۔ "ایں۔ ہاں۔ آج سر راس مسعود کا انتقال ہو گیا۔"

بیگم نے کہا۔ "تو کیا دفتر بند ہے آج؟"

ہم نے کہا۔ "دفتر کیوں بند ہونے لگا۔"

بیگم نے کہا۔ "تو پھر آپ نے یہ کیوں کہا۔ میں تو پوچھ رہی ہوں کہ آج دفتر جانا ہے یا نہیں۔"

ہم نے سنبھل کر کہا۔ "اچھا۔ میں سمجھا کہ اخبار کی کوئی تازہ خبر پوچھ رہی ہیں آپ۔"

بیگم نے مسکرا کر کہا۔ "یہ کیوں نہ کہیے کہ گانے کی طرف دھیان تھا۔"

ہم پہلے تو بالکل چوروں کی طرح کچھ سٹپٹا سے گئے۔ اس کے بعد پھر شوہرانہ سیاست کو بروئے کار لا کر کہا۔ "گانا ــــ لاحول ولا قوۃ، اس گانے سے تو میں تنگ آگیا ہوں۔ دماغ خراب کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ چالیس روز یہ گانا سن لیا جائے۔"

بیگم نے کہا۔ "مگر آپ بہکے ہوئے تو کچھ ایسے ہی تھے۔ کہ گویا ہمہ تن گوش بنے بیٹھے ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "بہکے ہوئے۔ ارے بیگم میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر تمھاری

پڑوسن نے اپنا گانا یوں ہی جاری رکھا تو تم مجھ کو کچھ دنوں کے بعد سنکا ہوا اور کچھ دنوں کے بعد بالکل ہی دیوانہ پاؤ گی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ میری موت اب اسی گانے کے ہاتھوں آئی ہوئی ہے۔"

بیگم کو ہنسی آ گئی۔ اور ہم نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ اور پھر ان کو اس طرف سے خالی الذہن بنانے کے لئے پوچھا۔ "آپ نے تو اپنا گانا کبھی سنایا ہی نہیں۔ معلوم نہیں کتنا سیکھا ہے۔ اور ہارمونیم بھی کبھی آپ نے نہیں سنایا۔"

بیگم غالباً مدت سے اس فرمائش کی منتظر تھیں۔ ذرا مسکرا کر اور دوپٹہ کا آنچل دونوں ہاتھوں سے ذرا سا لہرا کر بولیں۔ "آپ کو کس وقت سناؤں۔ آپ گھر پر کبھی بیٹھتے بھی ہیں؟"

ہم نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اسی وقت اس کڑوی دوا کو پی لیں۔ لہٰذا ان سے کہا۔ "تو کیا اس وقت میں گھر میں نہیں بلکہ گھر کے باہر کہیں بیٹھا ہوا ہوں؟"

بیگم مسکراتی ہوئی اٹھیں اور اپنا ہارمونیم اٹھا لائیں۔ ہم نہایت ادب سے دو زانو بیٹھ گئے، تاکہ ان کے ذوق موسیقی کا پورا احترام ہو سکے۔ بیگم نے ہزارہا تکلفات کے بعد ہارمونیم کے سروں کو چھیڑا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں ہم کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ ہماری رفیقۂ حیات ہارمونیم پر مختلف جانوروں کی آواز خوب پیدا کر لیتی ہے، کبھی تو معلوم ہوتا تھا کہ بلیاں رات کے سناٹے میں لڑ رہی ہیں۔ کبھی کتوں کی جنگ کا لطف آتا تھا۔ اور بعض اوقات یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس ہارمونیم میں پورا عجائب خانہ بند ہے اور بھانت بھانت کے جانور اپنی اپنی بولی بول رہے ہیں۔ مگر ہم تھے کہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ

ہارمونیم سننے میں مصروف تھے۔ آخر بیگم نے ہارمونیم کے اُن سروں کو چھیڑا جن سے یکایک مُغلیوں کے پشتوں میں لڑنے کی آوازیں نکلنے لگیں۔ مگر اس وقت بھی ہم گویا اثر لیے رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب بیگم نے اپنا یہ نقارخانہ بند کیا، تو ہم نے ایک طوطی کی طرح کہا: "آپ نے تو ماشاء اللہ بہت جلد سیکھ لیا۔"

بیگم نے کسرِ نفسی کے ساتھ کہا، "ابھی کہاں سیکھا ہے ابھی تو سیکھ رہی ہوں۔ تھوڑی دیر وہ بیچاری بتا دیتی ہیں۔"

ہم نے کہا: "اگر یہ ابتدا ہے تو انتہا یقیناً قیامت ہوگی۔ اور گانا؟"

بیگم نے کہا: "ہئی اللہ۔ تو کیا اب گانا بھی سناؤں؟"

ہم نے کہا: "بات یہ ہے کہ صبح سے آپ کی پڑوسن نے گانا سنا کر جو حال کیا ہے، اس وقت اس کی تلافی چاہتا ہوں۔ اگر سنا دیجیے گا تو ممکن ہے کہ غم غلط ہو جائے۔"

بیگم نے پھر ایک باکمال مغنی کی طرح ہزاروں تکلفات کے ساتھ ہارمونیم گھسیٹ کر چیاؤں میاؤں شروع کر دیا۔ اور اس کے بعد پہلے تو بڑی دیر تک شرماتی رہیں، آخر بمشکل تمام آپ نے اپنی تھراتی ہوئی آواز میں "سا رے — گا — ما — پا — دھا — نی" کچھ اس طرح الاپا کہ گویا فنِ موسیقی کو دامن پھیلا پھیلا کر کوس رہی ہیں۔ وہ دیر تک اسی سرگم کی الٹ پھیر میں مصروف رہیں آخر انہوں نے ہارمونیم بند ہی کیا تھا کہ دیوار کے اوپر سے آواز آئی۔ "اپنا کل کا سبق سنائیے نا!"

اب جو ہم دیکھتے ہیں تو آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا۔ سرخ سرخ ستارے

میں لپٹا ہوا چمکدار سیاہ رنگ، یقین جانیئے کہ ہم نے اس قد وقامت کی گھونچی اب تک نہیں دیکھی تھی۔ پھر لطف یہ کہ سیاہ رنگ ہی نہیں بلکہ چہرہ کی ساخت بھی ایسی تھی کہ گویا تھوپ تھوپ کر بنایا گیا ہے۔ ہم کو یقین ہے کہ جس فرشتہ نے یہ ہیولہ تیار کیا ہوگا اس کو ملائک کی صف سے ضرور نکال دیا گیا ہوگا۔ یہ ہماری بیگم کی استانی صاحبہ تھیں یعنی وہی مسماۃ جن کی آواز نے ہم کو خدا جانے کس غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ تو کہیئے کہ بیگم کو ہم پر زیادہ شبہ نہیں ہوا ورنہ ہماری بدنیتی تو خیر ثابت ہی ہوتی۔ مگر ضعف بصر میں بھی کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلے تو شاید بیگم مکان تبدیل کرنے کو کہتیں مگر اب ہم خود سنجیدگی کے ساتھ اس مکان کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں آسیبی خلل ہے اور نہایت خبیث روحوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو بیگم کا گانا سننا پڑتا ہے۔ دوسری طرف ان کی استانی جی کو دیکھنا بھی کچھ کم قیامت نہیں ہے گویا اگر اس گھر میں رہنا ہے تو اندھے اور بہرے ہو کر رہیں ورنہ رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں گانا نہ ہو

بحرالعلوم

یونیورسٹی کے لڑکوں کو دن بھر لکچر پلانے کے ساتھ ہی اپنا دماغ چٹانے کے بعد ڈاکٹر فیروز نے سہ پہر کو دریا میں کشتی پر سیر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت آسمان پر کالی گھٹاؤں کے قافلے پر قافلے چلے آ رہے تھے۔ اور ہوا کے تیز جھونکے عجیب تموّجی ماحول مرتب کر رہے تھے، ڈاکٹر فیروز نے دریا کے کنارے پہنچ کر ایک ملاح کو کشتی لانے کا اشارہ کیا۔ اور کشتی پر سوار ہو کر اس کو دھارے پر چھوڑ دینے کا حکم دے کر خاموش بیٹھ رہے، آپ کی نظریں اس وقت اس لنگوٹی بند اور محض ستر پوش ورنہ برہنہ ملاح پر جمی ہوئی تھیں جو مسلسل مشین کی طرح اپنا ہاتھ چلا رہا تھا اور ہاتھ جنبشوں کے ساتھ اس کی پشت پر شانوں کے نیچے عجیب قسم کے بھنور پیدا ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر فیروز اس وقت بھی افکار اور دماغی الجھنوں سے آزاد نہ تھے، کچھ نہیں تو آپ کو اس وقت یہی فکر تھی کہ اس ملاح اور ایک جانور میں کیا فرق ہے۔ یہ تقریباً برہنہ جفاکش انسان گو صورتاً انسان ہے مگر اس بیچارے کو دراصل یہ بھی نہیں معلوم کہ انسان کی تعریف کیا ہے۔ اور انسانیت کے حقوق کیا ہیں۔ اس کی زندگی کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اس طرح جفاکشی کرے اور جانوروں کی طرح اپنا پیٹ بھر لے۔ اس سے زیادہ یہ بیچارہ اور کچھ جاننا ہی نہ ہوگا۔ دیر تک ان ہی الجھنوں

میں محو رہنے کے بعد یکایک آپ نے ملاح سے پوچھا:-

"کیوں جی تم کو معلوم ہے کہ بیالوجی کس کو کہتے ہیں؟"

ملاح نے احمقانہ انداز سے پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا۔ اور نہایت سادگی سے کہا "ہم کا جانی بابو جی۔ کونو بروا ہو ہیئے۔"

پروفیسر نے حقارت کے ساتھ منہ چڑھا کر کہا "نو۔ نو۔ بروا کیا معنی یعنی پودا۔ یہ پودا نہیں ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ بیالوجی سے تم واقف ہو؟"

ملاح نے پھر پروفیسر کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اور اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "بالو کو پوچھت ہو بابو جی جون ندی کنارے ہوت ہے۔"

پروفیسر صاحب نے دانت پیس کر کہا۔ "شیم شیم۔ افسوس کہ تم نے اپنی زندگی بیکار گنوائی، تم اتنے بڑے ہو کر بھی بیالوجی سے واقف نہیں ہو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم یونان کے حکیموں میں سب سے بہتر کس کو سمجھتے ہو۔ اور کیوں مشرح اور مدلل بیان دو۔"

ملاح نے منہ اٹھا کر کہا "ہاں بابو جی سچ کہت ہو۔"

پروفیسر نے کہا۔ "نہیں سمجھے تم بیوقوف آدمی۔ میں کہتا ہوں کہ یونان کے حکیموں میں تمہارا انتخاب کیا ہے؟"

ملاح نے کہا۔ "سرکار ہم حکیمن سے بہت دور بھاگت ہیں، ہمرے بید جی بڑے ہسیار آہیں۔ لونا دوا برا کم پڑا تون یاک دن مان دوئی گولین سے جوڑی جات رہی۔"

پروفیسر صاحب نے اپنی ران پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔ "او نانسنس

تم تو بالکل — ہوپ لس ہو — تمہارا نام کیا ہے؟"

ملاح نے کہا۔ "مداری سرکار۔"

پروفیسر نے کہا۔ "تمہارے باپ کا نام؟"

ملاح نے کہا۔ "باپ تو کجا کر گیا بابو جی۔"

پروفیسر صاحب نے کہا۔ "یعنی مر گیا۔ جب زندہ تھا تو اس کا کیا نام تھا؟"

ملاح نے عاجز عاجزی کے ساتھ کھیسیں نکال کر کہا۔ "ناہیں جانت سرکار ہم بہت چھوٹ رہین جبہن ہمرا باپ کجا کر گیا۔"

پروفیسر صاحب نے اپنے دانتوں کے نیچے انگلی دبا کر دیر تک "چچ چچ چچ" کرنے کے بعد کہا: "افسوس کہ اس ہندوستان میں ایسے انسان بھی رہتے ہیں جو اپنے باپ تک کا نام نہیں جانتے۔ ان سے بھلا اور کیا توقع ہو سکتی ہے یہ دنیا کی ترقیوں سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ قدرت اپنے سربستہ راز انسان پر کیونکر کھول رہی ہے اور یہ کیا جانیں کہ انسان اپنی پستیوں سے ابھر کر کس قدر سرعت کے ساتھ قدرت کی ہمسری کے لئے اپنے کو تیار کر رہا ہے۔ مگر کیا کبھی ایسا دور بھی آسکتا ہے کہ یہ حیوان مطلق قسم کا انسان بھی ان ترقیوں سے آگاہ ہو سکے۔ اور ان علوم سے استفادہ کر سکے جو انسان نے حاصل کئے ہیں — پروفیسر صاحب دیر تک اس ملاح کی جہالت پر افسوس فرماتے رہے آخر کار آپ نے بہت غور اور فکر کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر اس سے بحری معاملات پر گفتگو کی جائے تو شاید یہ مناسب جواب دے سکے، چنانچہ آپ نے نہایت آسان سوال سمجھ کر دریافت کیا "کیوں جی مداری یہ بتاؤ کہ اگر

دریائے گنگا بجائے خلیج بنگال میں گرنے کے دریائے سندھ کی طرح پنجاب کو عبور کرتا ہوا بحیرۂ عرب میں گرتا تو یو۔پی کا کیا حشر ہوتا؟"۔

ملاح پہلے تو غور سے سنتا رہا اس کے بعد خود بخود ہنس کر کہنے لگا۔ "کا جانی بابو صاحب تم کا کہت ہو"

پروفیسر صاحب نے اس کے سر ہوتے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ تم دنیا کا کون سا علم جانتے ہو؟"

ملاح نے کہا۔ "جون کہو بابو جی۔ جانت کا ہے ناہیں ملا یہ بات آئے کہ تم پڑھے منشی ہو اور ہم دوئی ٹکے کا چھوٹ آدمی تم ہمرے مائی باپ ہو۔"

پروفیسر صاحب نے کہا۔ "کیا بکتے ہو۔ اچھا ایک بات کا جواب دو۔ تم جغرافیہ جانتے ہو؟"

ملاح نے کہا۔ "ناہیں بابو جی، یو ہمری بستی میں ناہیں رہت ہیں۔"

پروفیسر صاحب نے کہا۔ "شٹ تم تاریخ جانتے ہو؟"

ملاح نے کہا۔ "ہاں بابو جی آج پھاگن کیر جانو آٹھ تاریخ ہے۔"

پروفیسر صاحب نے جز بز ہو کر کہا۔ "شٹ اپ، اچھا یہ بتاؤ کہ تم ہندوستان کے شاعروں میں کس کو سب سے بہتر سمجھتے ہو؟"

ملاح نے کہا۔ "بابو جی یو بات آئے کہ ہم دیکھا سب کا ہے ملا جون وخت پر مل جائے او ہی سمجھو کہ اچھا آئے۔"

پروفیسر صاحب کلکلا کر رہ گئے، اور طے کر لیا کہ اب اس جانور سے کوئی سوال نہ کریں گے اس لئے کہ ان کے نزدیک وہ بالکل چوپایہ تھا، مگر اب ان کو اس بات پر انتہائی ندامت ہو رہی تھی کہ بحیثیت انسان کے وہ خود اسی درجہ میں تھے جس میں یہ کندۂ ناتراش ملاح تھا اگر اس وقت بس چلتا تو ڈاکٹر فیروز یا تو فرشتہ بن جاتے ورنہ انسانیت کا جامہ اتار کر حیوان بن جاتے مگر اس صنف میں ہرگز نہ رہتے جس میں یہ ملاح تھا۔ ملاح کے عبرت انگیز

جہل پہ وہ مسلسل غور کر رہے تھے ، اور ان کے نزدیک ہندوستان اس وقت تک کسی ترقی کا مستحق نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے باشندے اس ملاح کی قسم کے پائے جاتے ہیں وہ اسی فکر میں مستغرق تھے کہ یکایک ملاح نے نہایت گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بابوجی ناؤ بھنور ماں پھنس گئی۔"

پروفیسر صاحب نے لاپروائی سے کہا "تو پھر میں کیا کروں؟"

ملاح نے کہا۔ "کچھو نا نہیں بابوجی ملا بو بتاؤ کہ تیرنا جانت ہو نا؟"

پروفیسر صاحب نے کہا "میں بھی کیا تیری طرح کوئی جاہل ملاح ہوں کہ تیرنا جانوں۔"

ملاح نے تشویش انگیز انداز سے کہا "تو ن بابوجی پھر کا ہوئے۔ نیّا تو اب جاتو ہت نا نہیں۔ یوں بھنور ما ڈوبے بنا نا نہیں رہیہے۔"

اب تو پروفیسر صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، اور سر چکرا گیا۔ گھبرا کر بولے "ارے بھائی کسی طرح اس موت کے منہ سے نکالو۔ تم ایک ہوشیار ملاح معلوم ہوتے ہو۔"

ملاح نے امکانی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "بابوجی تم تیرنا جانت نا نہیں ہو یہ بڑا جلم ہے۔ نیّا سسر تو اب جات ہے۔"

پروفیسر صاحب نے ناؤ کو بھنور میں چکر کاٹتے ہوئے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور لگے ان دعاؤں کو پڑھنے جو بچپن میں کبھی پڑھی تھیں اور اس وقت بڑی مشکل سے یاد آ رہی تھیں۔ کبھی خدا کو یاد کرتے تھے اور کبھی ناخدا کی خوشامد کرتے تھے، ملاح بھی امکانی جد و جہد کر رہا تھا کہ کسی طرح کشتی کو بھنور سے نکالے مگر اس کے ہاتھ پیر شل ہوئے جاتے تھے۔ اس کو پروفیسر صاحب کا ممکن ہے کہ خیال نہ ہو مگر ناؤ تو اس کی روزی کا ٹھیکرا تھی، اس کو وہ کسی نہ کسی طرح بچانا چاہتا تھا مگر ناؤ اس کے قابو سے باہر ہوتی جاتی تھی اور ادھر پروفیسر صاحب کا یہ حال تھا کہ ان کے جسم میں خون تو پہلے منجمد ہو ہی چکا تھا مگر اب تو روح بھی انجماد کی طرف رجوع ہو رہی تھی اور بیوی کی خوفناک بوگی

بچوں کی عبرت انگیز یتیمی گھر کا اجڑنا وغیرہ تو خیر یاد آ ہی رہا تھا مگر سب سے زیادہ خوف یہ تھا کہ معلوم نہیں پانی میں ڈوبنے کی موت کس قدر سخت ہوتی ہو۔ ڈوبنے کے بعد مچھلیاں اور دوسرے دریائی جانور اس طرح کھا جائیں گے جس طرح ہم خود مچھلی کھاتے ہیں۔ مصیبت تو یہ تھی کہ یہ خوفناک خیالات بھی کسی تسلسل اور تفصیل کے ساتھ ذہن میں نہیں آ رہے تھے بلکہ جس طرح سینما میں کسی نئے فلم کا نمونہ دکھایا جاتا ہے اسی طرح کہیں کہیں سے کچھ کچھ مناظر اس وقت پروفیسر صاحب کے ذہن میں بھی آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ گرداب نے ناؤ کو ایک لٹو کی طرح نچانا شروع کر دیا۔ اور موجیں اس کو ایک معمولی تنکے کی طرح ادھر سے ادھر اچھالنے لگیں، پانی کشتی کے اندر آنے لگا۔ اور اب پروفیسر صاحب نے اپنے کو موت کی آغوش میں دے کر صبر و سکون کے ساتھ مرنے کا ارادہ کر لیا، البتہ کبھی کبھی ایک چیخ کے ساتھ "اے بھیا مداری" کا نعرہ بلند کر دیتے تھے، آخر کار مداری نے کشتی کے اوپر سے ایک جست لگائی اور پروفیسر صاحب سے چیخ کر کہا "پھاند پڑو بابو" پروفیسر نے بھی ایک ڈبکی کھائی اور دیکھتے ہی دیکھتے ناؤ موجوں میں گم ہو گئی

ڈاکٹر فیروز کی جب آنکھ کھلی تو وہ ملاح کی جھونپڑی میں پیال پر پڑے ہوئے تھے اور مداری قریب ہی بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا، ڈاکٹر فیروز کو بیدار دیکھ کر مداری نے کہا۔ "اٹھو بابو جی اب تم اچھے ہو۔" ڈاکٹر فیروز نے کہا "اچھا ہونا یا نہ ہونا تو دوسری بات ہے، یہ بتاؤ کہ زندہ بھی ہیں یا نہیں؟"

مداری نے کہا "بابو جی اگر تمری نا ہم تو پڑھے لکھے ہوت تو ن آج ہم دونوں گومتی میا کی بھینٹ بن کر رہت ملا بابو جی ہمرا علم بھی کام آ گوا۔"

ڈاکٹر فیروز نے ندامت سے گردن جھکا لی کہ گویا وہ جاہل مطلق ہیں اور ملاح کوئی بحر العلوم ہے، آخر کار ڈاکٹر فیروز نے ملاح کو کشتی تو دوسری بنوا ہی دی مگر اب وہ اسی جاہل ملاح کے نہایت عقیدت کیش شاگرد ہیں اور تیراکی سیکھ رہے ہیں۔